رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

جلد (۱۰) عدد (۲)
صفر المظفر سنہ ۱۳۵۶ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ (۸/)

قیمت سالانہ (صمہ)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا' اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت' یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت [illegible] جلد (سکہ) انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] سکہ انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ!

فہرست مضامین

ماہ صفر سنہ ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ مہینے اشارات کے سلسلہ میں ہم نے اُس انقلاب کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی تھی جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے، اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی قومی تہذیب کی حفاظت کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کی نوعیت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومیت اور ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر ایک سرسری تبصرہ کر چکے ہیں جس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت کمزوری کی آخری سرحدوں پر ہیں۔

ان کا سوادِ اعظم اپنی قومی تہذیب اور اس کی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہے حتیٰ کہ اس میں اُن حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیّز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ ان کے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات قبول کر رہے ہیں اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا، بلکہ زنانہ کیرکٹر بن گیا ہے جس کی نمایاں خصوصیّت تاثر اور انفعال ہے، ہر قوت

ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے، ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے، ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، انکی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، ان کے اصول حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ وہ اول تو اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ پھر ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظام جماعت حد سے زیادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدود اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے

انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنیاد پر جماعتیں بنتی ہیں اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحاد عمل اور مخلصانہ و بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں۔ مہیب خطرات ان کے سامنے آئے، مگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراک عمل کے لیے

جمع نہ کرسکی۔ تازہ ترین واقعہ مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوری کا راز اپنوں سے زیادہ غیروں پر فاش کردیا۔ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں، مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کرسکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کرسکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی رائے، اپنی آسایش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کرسکیں۔

افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت، اور بندۂ نفس بنادیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام و نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی خدمت بجالانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہاں کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا، آج اتنا سستا ہوگیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے، ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہوسکتا ہے۔ ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جاسکتا ہے، اک ذرا سی شہرت، ناموری عطا کرکے اور دو چار جے کے نعرے لگا کر اس کو خرید لیا جاسکتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لیے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار ان کو مل گئے، جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے، حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود نہ

ہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بری نہ معلوم ہو تو ہم صاف کہدیں کہ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکیٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبانوں سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر ہی نہیں ہے، تو ہمارا حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکار برطانیہ کی غلامی کا زرین پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بکثرت اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحب قلم، صاحب زبان، صاحب مال و زر، صاحب اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے برأت کا صریح اعلان نہیں کرتے، اس لیے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکہ کھا کر انھیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے۔ مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لیے پیام موت ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں،

اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانون اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھینگے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے کہیں سے نکلی ہو، اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے، اور اسلامی قومیت کا ایک جزء رہنے کی وجہ سے اس کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع ملجاتا ہے۔

یہ حالت ہے اس وقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سرے پر کھڑی ہے انقلاب کی فطرت، بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے اس کے زور کا مقابلہ اگر کچھ کرسکتی ہیں تو مضبوط جمی ہوئی چٹانیں ہی کرسکتی ہیں بوسیدہ عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون وجمود کی بدولت کھڑی ہوں، ان کا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحب بصیرت انسان اس وقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈلے گا وہ بیک نظر معلوم کرلے گا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے انقلابی دور میں اپنے قومی تشخص اور اپنی قومی تہذیب کے خصائص کو بچائے جانا اور اپنے حقوق کو پامالی سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اول تو جہالت کی بنا پر وہ بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کرلے گی۔ پھر زمانہ کیر کثر اس کو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کردے گا جن کو وہ جانتی ہو گی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک بلا مقابلہ شکست کھا جانے کے بعد اگر کچھ احساسات باقی رہ گئے اور کسی شدید حملے پر وہ بیدار بھی ہوئے اور اس نے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی بھی چاہی تو نہ کرسکیگی، کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اس کے لیے

کوئی متحدہ جد وجہد کرنا مشکل ہوگا، اور خود اسی کے گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن، غدار اور منافق اس کے قومی حقوق کو پامال کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اگر آنے والا انقلاب محض ایک سیاسی انقلاب ہوتا تب بھی خطرہ کچھ کم نہ تھا، لیکن یہاں تو جو انقلاب آرہا ہے وہ سیاسی انقلاب سے بڑھ کر ایک فکری اور عمرانی انقلاب ہے۔ اس کے آثار و نتائج کو اگر آپ اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو زیادہ گہری نظر سے اُن قوتوں کو دیکھیے جو اس انقلاب میں کام کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت دراصل نتیجہ ہے اُس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں ہے بلکہ فکری اور عمرانی بھی ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری و عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجہ سے بالکل برعکس ہے۔ انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کا سبق دیا اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بندِ غلامی کو توڑ کر پھینک دیں۔ لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن نے ان کو پوری طرح مغرب کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پا لیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی نقشہ اُس نقشہ کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو ان کے سامنے اہلِ مغرب نے پیش کیا ہے۔ وہ جس قسم کی آزادی کے لیے جد وجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو، اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور اپنے وسائلِ معیشت کو خود اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے۔ لیکن یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی

زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے وہ از سر تا پا فرنگی ہے۔ ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں، جس قدر عمرانی اصول ہیں، سب کے سب مغرب سے حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، ان کی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے میں ڈھلی ہوی ہے۔ بلکہ انقلابیت کے بُحران نے ان کو (یا کم از کم ان کے سب سے زیادہ پرجوش طبقوں کو) فرنگیوں میں سے بھی اُس قوم کا متبع بنا دیا ہے جو انتہا پسندی میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ وہ پکے مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب کو وہ شر و فساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑھ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ رواداری جو مذہب کے ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنی عبادت گاہوں اور اپنے مراسم میں جینے دیں۔ باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا ان کا نصب العین ہے اور ان کے نزدیک اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیش نظر ہے اس میں مذہبی جماعتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو، اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے، اور وہی اس وقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لیے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اس کی طرف کھنچ رہے ہیں۔

انگریز کی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مشترک جد و جہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے۔ اور جو گروہ اس جد و جہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو اس کی طرف دلوں کا مائل ہونا، اور اس کے ساتھ شریک عمل ہو جانا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کی طرف جا رہی ہے اور عامۂ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہو جائیں لیکن عمل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ جب یہ قوم کانگریس میں شریک ہو گی اور اس کے عوام سے کانگریسی کارکنوں کا رابطہ قائم ہو گا تو آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں ان کے درمیان پھیلیں گی؟ کس کس طرح مسلمانوں کے عوام اُن اجتماعی نظریات ان ملحدانہ افکار، ان غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہوں گے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں؟ کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اُس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پھیلائے جائیں گے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ ہم رشتہ ہے؟ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علی رغم انفِ علماء روزگار جدید ترین مغربی و اشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرے؟ کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کیے جائیں گے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں؟ ان حالات میں آپ کے پاس کونسی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حدود میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپ نے

ان کو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس یہ اطمینان کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ کسی ضرورت کے موقع پر آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کو جمع کر سکیں گے اور ان کی متحدہ طاقت آپ کی پشت پر ہوگی؟

انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے، بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہوگا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے۔ لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جائیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ ہم کو انگریز سے اس لیے عداوت نہیں ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دور سے آیا ہے، ہمارے وطن میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ ہماری عداوت اس بنا پر ہے کہ وہ غیر صالح ہے۔ ناجائز طریقہ سے حکومت کرتا ہے، عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کے بجائے فساد برپا کرتا ہے۔ اگر یہی کچھ دوسرے کریں تو ہم محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کرسکتے کہ وہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صہیب اور سلمان کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کرسکتا۔ پس اگر آپ مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے بلکہ حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا ضرور آپ کا فرض ہے، مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار رہنا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد ہے، عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر حق کو قائم کرنا ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کے خلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجیے جو اس کو مٹانا

چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنے کے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟ کونسی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجیے۔ یہی بتائیے کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانے کا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے، ہم دستور اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے ہمارے حقوق پر آنچ نہ آنے پائے۔ بلاشبہہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ مگر شائد آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستور اساسی کے تحفظات اور دوسرے تمام کاغذی مواثیق صرف اُسی قوم کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جس میں ایک طاقتور رائے عام موجود ہو، جو اپنے حقوق کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو پہچانتی ہو، اس کی حفاظت کا ناقابل تسخیر ارادہ رکھتی ہو، اور منفرداً و مجتمعاً اس کی طرف سے مدافعت کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہو۔ یہ صفات اگر آپ کی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ کی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھیے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ آپ دستور اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اندرونی انقلاب کا آپ کے پاس کونسا علاج ہے؟ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے اور آپ کی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں۔ کونسا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اس کے زہریلے نتائج کو روکنے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ فرض کیجیے کہ سول میرج کے طریقہ پر مخلوط نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپ کی قوم خود اس تحریک سے متأثر ہو جاتی ہے۔

کونسی آئینی ضمانت اس کی روک تھام کرسکے گی؟ فرض کیجیے کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپگنڈا کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کردی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو۔ آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصول اسلام کے خلاف ہوں۔ خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہوجاتی ہیں جو آپکے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں۔ وہ کونسے "بنیادی حقوق" ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو منسوخ کراسکیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ کی قوم بتدریج ہمسایہ اقوام کے طرز معاشرت، آداب و اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے اور اپنے قومی امتیازات کو خود مٹانے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کریگا؟ آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس لیے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شریک ہیں ان کے نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ ان کا طرز عمل انگریز کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ وہی ذہنی غلامی، وہی زنانہ انفعال و تاثر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو آستانہ فرنگ کے طائفین و عاکفین میں نظر آتی ہے۔ پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے یہ کھلے ہوئے علائم و آثار آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آخر کس بھروسہ پر آپ ساری قوم کو ادھر لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمائیے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب اور تدریجی انجذاب کو روکنے کے لیے کونسا تحفظ فراہم کر رکھا ہے؟

مسلمانوں میں اس وقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادی وطن کے لیے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھینچ رہا ہے یا کھینچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی

یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالم حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کی رفتار کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کر دی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہو جائے گی، ایسی ذلیل پالسی دنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود زندہ رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، جس میں خود اپنے وجود اور اپنے حقوق کی حفاظت کا بل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے پر جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اس کے لیے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اس کی خاطر رکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مدت ہوتی ہے۔ انگریز کے لیے بھی بہرحال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہوگی۔ اس کے بعد وہی قوم برسر اقتدار آئے گی جس میں ہمت اور طاقت ہوگی، حاکمانہ اوصاف ہوں گے، عزائم اور حوصلے ہوں گے، صلابت اور عصبیت ہوگی۔ اگر تم میں یہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہرحال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت، اور ذلت کی موت ہی ہے۔ گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی تو ہو سکتی ہے مگر وہ ہمیشہ نکڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کر رہے گا، اور لاش کبھی نہ کبھی گر کر رہے گی۔

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقا کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معرکہ میں اُن کے لیے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لیے مقابلہ اور مزاحمت کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک دور کے خاتمہ اور دوسرے دور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلہ کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت پر سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور

موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مرنا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشہ دیکھے جاؤ۔ لیکن اگر زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سستی رفتار کا زمانہ نہیں ہے صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اس وقت ہندوستان اور ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اُس کی خاطر اپنی سنت کو بدل ڈالے۔

جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیے۔ حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں حکمت اور تدبر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیے۔ خصوصاً نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور ابلہانہ شتاب روی کا وقت نہیں۔ قدم اٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر سوچیے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیے؟ آپ کی منزل مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف جانے کا صحیح راستہ کونسا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کے لیے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا ہوگا؟ اور ہر مرحلے سے سلامت گذر جانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

آئندہ اشاعت میں انہی سوالات پر ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

مقالات

شخصیت پرستی

(۲)

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز

(۳) رواۃ پرستی اس جامد تقلید کی خرابیوں کا احساس آج سے کچھ عرصہ پہلے ہوا اور ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے اس کی شکست وریخت کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ یہ کوشش بڑی مبارک تھی لیکن شائد ابھی مسلمانوں کے ابتلار کا زمانہ ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اُن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ۔

خواستم پیکاں برآرم در جگر نشتر شکست

ائمہ پرستی کے کانٹوں سے دامن چھڑانے گئے تھے خود ایک اور جھاڑی میں الجھ کے رہ گئے۔

نبیٔ اکرم نے خدا کا پیغام دنیا تک پہنچا دیا، اور اس پر عمل کرکے دکھا دیا کہ یہ ہے دین جس کی تکمیل ہوئی ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ دین نام ہوا قرآن کریم اور اسوہ حسنہ کا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود باری تعالیٰ نے لے لیا رہا اسوہ حسنہ تو وہ چونکہ ایک محسوس شے تھا، وہ قرناً بعد قرنٍ متواتر چلا آتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں یقینی ہیں۔ ان کے علاوہ حضور کے جو اقوال و افعال اور اس عہد مبارک کے جو حالات ہم تک بروایت آحاد پہنچینگے وہ یقینی نہ ہوں گے ظنی ہوں گے۔ احادیث کا مجموعہ اسی شق میں داخل ہے اگر وہ بھی جزو دین ہوتا تو حضور احادیث مقدسہ کو قرآن کی طرح لکھوا کر، یاد کرا کر، سن کر سنا کر، اُن کے حفظ و ضبط کا اطمینان فرما کر تشریف لے جاتے کہ منصب رسالت کا یہ تقاضا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ لیکن جب بعد میں اس عہد مبارک کے حالات، جو سینہ بسینہ روایات

کی صورت میں چلے آتے تھے، قلمبند ہوئے، تو احادیث کے مجموعے بھی مرتب ہوئے۔ مورخین نے عام تاریخ کی چھان بین اپنی بساط و احتیاط کے مطابق کی۔ جامعین احادیث (علیہم الرحمۃ) نے احادیث کی ان سے بھی زیادہ تحقیق اور احتیاط سے تدوین کی، کہ یہ محبوب اور ہادی کی باتیں تھیں۔ ان کی جمع و تدوین میں محبت و عقیدت کا جذبہ بھی ساتھ شامل تھا۔ مزید احتیاط یہ بھی کی کہ جن جن واسطوں سے کسی قول یا فعل منسوب الی الرسول کو انہوں نے لیا تھا وہ واسطے بھی محفوظ کر لیے فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔ لیکن احادیث کے ان مجموعوں کی چھان بین اس نہج سے کی گئی کہ جس جس راوی سے کوئی حدیث ملی تھی اس کے متعلق حتی الامکان یہ تحقیق کر لیا گیا کہ وہ ثقہ تھا، صحیح الحفظ تھا، پرہیز گار تھا، متقی تھا۔ عام طور پر جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب اس سلسلہ میں دیکھیے کہ کس قدر انسان راستہ میں آ گئے۔

(۱) لاکھوں رواۃ حدیث۔

(۲) علماء جرح و تعدیل۔

(۳) جامعین احادیث۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مجموعے تمام تر انسانی کاوش و احتیاط کے رہین منت ہیں اور چند تاریخ کی دیگر کتب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں لیکن بالآخر ہیں تو انسانی کارنامے ہی۔ خدا کی حفاظت کی ذمہ داری تو ان کے ساتھ نہیں۔ اب ان جامعین احادیث اور علماء جرح و تعدیل کو تنقید سے بالاتر سمجھ لینا اور ان کی ہدایات کو جوں کا توں تسلیم کر لینا، ان کو بشریت کی سطح سے اوپر لیجانا ہے۔ اور حضرات رواۃ کے متعلق خواہ وہ کتنے ہی ثقہ اور عدول ہوں یہ عقیدہ رکھنا کہ ان سے غلط بیانی، یا مفہوم کو غلط سمجھنے یا غلط ادا کرنے کا امکان ہی نہ تھا، ان کو معصوم اور منزہ عن الخطاء قرار دینا ہے جو صرف حضرات انبیاء کرام کا ہی حصہ ہے۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو بات کانوں کے راستے قلب تک پہنچے اور پھر قلب سے زبان کی راہ باہر آئے اس پر قلب انسانی کی رنگینی کا کچھ نہ کچھ اثر ہو جانا مستبعد نہیں۔ اور جب یہ سلسلہ دس بیس کڑیوں تک مسلسل چلا جائے تو

ظاہر ہے کہ قول اول اور قول آخر میں کس قدر انسانی قلوب کی آمیزش ہو جائے گی ضروری نہیں کہ یہ آمیزش ارادۃً ہی ہو، غیر ارادی طور پر غیر محسوس طور پر اس کا اثر اس میں آ جائے گا۔ (اور آمیزش کسی نے بالارادہ کر دی ہو۔ اس کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں)، یا تو یہ ہوتا کہ قرآن کی طرح حفظ احادیث بھی باللفظ ہوتا یعنی الفاظ رسول اللہؐ حفظ کیے جاتے یا لکھے جاتے، اور بعینہٖ وہی الفاظ حرفاً حرفاً منتقل کیے جاتے لیکن ایسا لفظی تواتر تو سوائے چند احادیث کے اور کہیں ثابت نہیں۔ تواتر معنوی میں اس فطرت انسانی کو نظر انداز کر دینا فی الحقیقت ان انسانوں کو مافوق البشر سمجھ لینا ہے۔ اور ارباب جرح و تعدیل کے متعلق یہ کہدینا کہ انہوں نے جھوٹ اور سچ کی تمیز میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھدیا بہت بڑا دعویٰ ہے۔ اس قسم کا علم غیب تو خود نبی اکرم کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اب اس قسم کے کسی مجموعہ کو جزو دین قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ قرآن کی طرح جوں کا توں واجب العمل ہے دین پر بہت بڑا اضافہ ہے یہ ظاہر ہے کہ ان مجموعوں کو سب "اقوالِ منسوب الی الرسول" ہی قرار دیتے ہیں۔ پھر ان کو ایسا سمجھتے ہوئے بھی "اقوال الرسول" کی طرح واجب الاطاعت جاننا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

قرآن سے پیشتر کی تمام کتب سماوی کو جو قرآن کریم نے ظنی اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ ان کی حفاظت بالالفاظ نہیں ہوئی تھی۔ اصل صحائف کے ضائع ہو جانے کے بعد ان کے جامعین نے ان صحائف کو اسی طرح سے مرتب کیا تھا جس طرح احادیث کے مجموعے ایک مدت کے بعد مرتب ہوئے۔ چنانچہ جس طرح ان میں تحریف، وضع، الحاق، ترمیم، نسیان کی گنجائش تھی اسی طرح احادیث کے مجموعوں میں بھی تھی۔ اُن میں بھی ایسا کچھ ہوا اور اِن میں بھی۔ واضعین احادیث کے تذکرے خود اس پر شاہد ہیں۔ ارباب جرح و تعدیل نے جو لاکھوں حدیثوں کو غیر معتبر سمجھ کر مسترد کر دیا وہ اس کی زندہ دلیل ہے۔ اب اگر کتب سابقہ کا کوئی نسخہ یقینی طور پر ان رسولوں کا قول قرار نہیں دیا جا سکتا، تو احادیث کا کوئی مجموعہ کس طرح یقینی طور پر حضورؐ کے ارشادات گرامی کا مجموعہ قرار دیا

جا سکتا ہے ؟ اتباع حدیث میں آپ بزعم خویش اطاعتِ رسول کر رہے ہوتے ہیں لیکن غور فرمائیے کہ ایک حدیث کو جزو دین ماننے کے لیے آپ کتنے انسانوں کو معصوم اور منزہ عن الخطاء ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں مقلدین نے تو زیادہ سے زیادہ چار انسانوں کو منزہ عن الخطاء قرار دیا تھا مگر یہ اپنے آپ کو تقلید کے پھندے سے آزاد سمجھتے ہوئے لاکھوں انسانوں کو منزہ عن الخطاء قرار دے رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم آزاد ہو گئے۔

باندھتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پابگل　　کیا وہ آزادی جہاں یہ حال ہو آزاد کا

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی تنقید میں اسناد سے بڑھ کر معیار قرآنی کو اہمیت دینی چاہیے تھی ہمارے پاس قرآن ایک مستند ضابطہ دین موجود ہے، ظاہر ہے کہ نبی اکرم کا کوئی ارشاد اصول قرآنی کے خلاف قطعاً نہیں ہو سکتا۔ لہذا ظنی شئے کو یقینی شے سے پرکھ لیجیے۔ معاملہ طے ہو جائے گا۔ اسناد کو مدار صحت قرار دینے میں یہ خرابی ہے کہ جب آپ نے ایک سلسلہ رواۃ کے متعلق یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ثقہ ہیں، تو اب جو بات بھی ان کی وساطت سے آپ تک پہنچے گی اُسے لازمی طور پر "قولِ رسول" ماننا پڑے گا خواہ اس کی حیثیت قرآنی میزان میں کچھ ہی کیوں نہ اُترے حالانکہ یہ بدیہیات میں سے ہے کہ ایک شخص کا متقی و پرہیزگار ہونا اس بات کے لیے بھی مستلزم نہیں کہ اس کی یادداشت درست ہو، اور اگر یادداشت بھی درست ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس میں معانی و حقائق کے سمجھنے کی استعداد، اور پھر اصل اسپرٹ اور موقع و محل کی فقیہانہ جزئیات کو ملحوظ رکھ کر آگے منتقل کرنے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جائے یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے کوئی عقیدہ جھٹلا نہیں سکتا اس قسم کی روایت پرستی نے ہمیں اصلِ دین سے اس قدر دور پھینک دیا ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اصولِ حدیث میں یہ بات بھی داخل ہے کہ صحیح حدیث وہ ہے جو اصول قرآنی کے خلاف نہ ہو لیکن احادیث کے مجموعوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قاعدہ کی رعایت میں بہت سہل انگاری برتی گئی ہے۔ اگر آج یہ اعتراض

کیا جائے کہ فلاں حدیث قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف پڑتی ہے تو اس کا جواب فوراً یہ دیدیا جاتا ہے کہ یہ تمہارے فہم قرآن کا نقص ہے۔ قرآن جیسا ائمہ متقدمین سمجھ گئے ہیں آج کون ویسا سمجھ سکتا ہے۔ لہذا آپ کو ماننا ہوگا کہ یہ ظاہری تعارض، دراصل تعارض نہیں ہے خواہ اس کے ماننے میں آپ کی بصیرت بغاوت کرے۔ خواہ قرآن کریم کی کھلی کھلی تعلیم اس کی تردید کر رہی ہو۔ حیرت ہے کہ جب یہی دلیل اہل فقہ، فقہ کے وجوب میں لائیں تو یہ پائے چوبین قرار دی جائے لیکن جب اپنے دعوی کا اثبات مقصود ہو تو اس کو حصن حصین سمجھ لیا جائے چونکہ آج ہمارا دین یا تو وہ ہے جو تقلید کے راستے سے آیا ہے یا وہ جو روایات کے ذریعہ سے پہنچا ہے، اس لیے آج جو دین سے عام بغاوت نظر آرہی ہے (مقلدین مغرب کا میں ذکر نہیں کر رہا، ان کے علاوہ بھی) وہ ہونی ضروری تھی، اور میرا تو خیال یہ ہے کہ جس طرح مقلدین حضرات بعض فقہی مجبوریوں کے وقت ادھر ادھر کے راستے تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح روایات کے پابند حضرات پر بھی کبھی نہ کبھی ایسی حالت ضرور آجاتی ہوگی کہ جس چیز کے صحیح ماننے پر ان کی بصیرت دلالت نہ کرتی ہو (بشرطیکہ وہ فہم قرآن پر مبنی ہو) وہ اپنے آپ کو اسے صحیح ماننے پر طوعاً وکرہاً مجبور کرتے ہوں کہ ایسا نہ کرنے سے انھیں ہزارہا ایسے انسانوں کو انسان ماننا پڑتا ہے جنہیں وہ اپنی عقیدت کی رو سے بالاتر از انسان سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ اگر یہ حضرات اتنی سی بات سمجھ لیں کہ قرآن یقینی ہے اور اس کے ماسوا ہمارے دیگر ذرائع علم ظنی، تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یقین کو چھوڑ کر ظن کا اتباع کسی طور بھی جائز نہیں ہو سکتا۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا۔ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ (۱۰: ۳۶)	ان میں سے اکثر ظن کا اتباع کرتے ہیں، حالانکہ ظن (انسان کو) حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔

روایات پرستی (بلکہ رواۃ پرستی) کے مظاہرے کی ہمارے سامنے دو اہم شہادتیں، یعنی سنی اور شیعہ

جماعتوں کا وجود ہے۔ سُنّی حضرات کے مجموعے اپنے ہیں اور ان کا سلسلۂ روایت تابعین وصحابہ (علیہم الرحمۃ) تک پہنچتا ہے۔ جو تعلیم ان مجموعوں میں جناب نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اس سے بہت ہی مختلف تعلیم احادیث کے اُن مجموعوں میں ہے جو شیعہ حضرات کے پاس ہیں اور جن کا سلسلۂ روایت بھی اسی طرح تابعین وصحابہ (علیہم الرحمۃ) تک پہنچتا ہے۔ اب یہ حضرات (کم از کم سُنّی حضرات) تو یہ تصور میں بھی نہیں لا سکتے کہ جو بزرگان دین ان احادیث کے راوی ہیں جو شیعہ حضرات کے مجموعوں میں ہیں وہ (نعوذ باللہ) سب جھوٹے اور غیر معتبر تھے۔ ان کو بھی لامحالہ ثقہ ماننا پڑے گا۔ اب صورت معاملہ یوں ہوئی کہ ثقہ رواۃ کی جماعت سے وہ احادیث امت کو ملیں جو سنی حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور ثقہ رواۃ ہی کی ایک دوسری جماعت سے وہ احادیث ملیں جو شیعہ حضرات کے ہاں صحیح ہیں۔ اور دونوں آپس میں ٹھیریں متناقض رواۃ کی جہت سے احادیث پرکھنے کے اصول پر آپ کو لازماً ان دونوں قسم کی احادیث کو اقوال رسولؐ ماننا پڑے گا۔ اور یہ دونوں مجموعے واجب الاتباع ہو جائیں گے۔ اب فرمائیے کہ احادیث کو دینی حجت (یقینی شے) نہ ماننے والوں کے خلاف آپ جو معصیتِ رسول کا الزام عائد کرتے ہیں اگر وہی اعتراض شیعہ حضرات آپ پر وارد کریں (اور وہ ایسے اعتراضات اکثر و بیشتر کرتے رہے ہیں) تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ احادیث کو قرآن کریم کے معیار پر جانچ لیجیے۔ یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ اگر کسی راوی کے ثقہ ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ارباب جرح و تعدیل یا جامعین احادیث کا ہم مسلک بھی ہو، تو یہ تو صاف پارٹی بازی ہے۔ انصاف نہیں ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو جماعت آپ کی ہم مسلک نہ ہو۔ اس میں سب کے سب جھوٹے اور غیر معتبر ہی ہوں۔ باقی رہی معصیتِ رسولؐ، سو اگر آج کوئی بات ثابت ہو جائے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد ہے تو پھر اسے جو دین نہ مانے اس کو دین سے کیا علاقہ کہ یہ وہ معصیت رسول ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے۔

پھر ایک چیز اور بھی ہے۔ یہ تو سب کو تسلیم ہے کہ حضور کے بعض ارشادات بہ منصب رسالت ہوتے تھے، اور بعض بالکل ذاتی حیثیت سے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں الجھنا چاہتا کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، اور اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں جس قدر حضورؐ کے اقوال و اعمال درج ہیں ان میں یہ تخصیص تو کہیں نہیں کی گئی کہ حضورؐ نے کس حیثیت سے ایسا کیا یا ایسا فرمایا۔ اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ امت کے لیے اطاعت اسی کی واجب ہے، جو حضور نے بہ منصب رسالت فرمایا ہو۔ ذاتی حیثیت کے متعلق تو خود حضور کے ارشادات موجود ہیں کہ وہ واجب الاتباع نہیں۔ اب ہم ان احادیث میں سے کسے واجب الاتباع قرار دیں اور کسے نہ قرار دیں؟ ظاہر ہے کہ جس چیز کا پہلے قول رسولؐ ہونا ہی ظنی ہو، اور پھر یہ بھی یقینی نہ ہو کہ اسے حضور نے کس حیثیت سے فرمایا تھا، اسے دین قرار دے دینا کس قدر زیادتی ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ کا اطلاق اگر عمومی بھی مان لیا جائے، تو بھی احادیث کے مجموعے تو اس ذیل میں آتے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مجموعے تو رسول نے ہم کو نہیں دیے۔ رسول اور امت کے درمیان اس باب میں تو لاکھوں متفرق انسان آگئے ہیں اور پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ لاکھوں حدیثوں کو یہ کہکر مسترد کردیں کہ وہ اقوال رسول نہیں ہوسکتیں تو آج امت سے یہ حق کیوں چھن گیا کہ وہ امام بخاریؒ یا دیگر ائمہؒ احادیث کے مجموعوں کو بھی پرکھ سکیں؟ اگر آج بھی ان مجموعوں کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر ایک الگ مجموعہ تیار کرلیا جائے تو ہرچند وہ بھی یقینی تو نہیں ہوسکیگا لیکن اس میں ایسی باتیں تو نہ ہوں گی جنہیں رسول اللہ کی طرف منسوب کرنے کی قرآن اجازت نہ دے۔ اور جن سے انسانی بصیرت ابا کرے۔ چونکہ یہ مجموعہ پھر تنقید سے بالا تر نہیں ہوسکتا اس لیے ممکن ہے کہ آنے والے زمانہ میں جوں جوں فہم قرآن بڑھتا چلا جائے۔ یہ مجموعہ اور مہذب ہوتا

چلا جائے۔

لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کی خدمت میں جب کبھی ایسی بات پیش کیجیے، وہ عوام کے جذبات کو فوراً یہ کہکر مشتعل کر دیتے ہیں کہ لو بھئی! دیکھو، یہ کہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) سب صحابہؓ جھوٹے تھے۔ اور رسول اللہ کی سب باتیں (معاذ اللہ) رطب و یابس ہیں۔ توبہ توبہ استغفر اللہ اتنا کہکر وہ خوش ہو جاتے ہیں کہ بس اب خدائی فوج اس ملحد و زندیق کو زندہ نہ چھوڑے گی۔ لیکن وہ یقین مانیں کہ ان ملاحدہ و زنادقہ" کے استیصال کے بعد بھی قرآن زندہ رہے گا اور ہر اس چیز کو مٹا کر چھوڑے گا جو اس کے خلاف پڑے گی، خواہ اسے آپ ائمہ سلف کی طرف منسوب کر دیجیے خواہ خود نبی اکرم کی ذاتِ مقدس کی طرف۔ اور اس کے بعد یا تو قرآن باقی رہے گا یا عمل متواتر (اسوۂ حسنہ) جو یقینی دین ہے۔ لہٰذا ڈرنا چاہیے اس وقت سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس میزان کے یہ دو پلڑے موجود نہ تھے کہ تم حق و باطل کی تمیز کر سکتے۔ (باقی)۔

استدراک

جناب پرویز کا اصل مقصد یہ ہے کہ روایات کی پابندی میں جو غلو کیا جاتا ہے، اور احادیث کے مجموعوں پر جس طرح آنکھیں بند کر کے ایمان لایا جاتا ہے، یہ بھی اسی قسم کی غلطی ہے، جس قسم کی غلطی فقہائے مجتہدین کی اندھی تقلید کرنے والے اور ان کے اجتہادات کو تنقید سے بالاتر سمجھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں چوہدری صاحب نے جو طریق بحث و استدلال اختیار کیا ہے اُس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہ وہ اس گروہ کے مسلک کی طرف جھک گئے ہیں جو بزعم خود "اہل قرآن" کے نام سے موسوم ہے پچھلے دنوں سفر دہلی کے موقع پر ہم نے چوہدری صاحب سے

زبانی عرض کیا تھا کہ مضمون کے اس حصہ پر نظر ثانی فرمالیں چنانچہ انہوں نے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ جو مقامات راہ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں، ان کو بدل دیں گے، لیکن غالباً مشغولیت کی وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ چونکہ ان کے مضمون کا سلسلہ توڑنا مناسب نہیں ہے، اس لیے اس حصہ کو ہم بجنسہٖ شائع کر رہے ہیں، مگر چند امور کی توضیح ضروری سمجھتے ہیں تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ ہیں معلوم ہے کہ خود صاحب مضمون کے خیالات بھی اس مسئلہ میں وہی ہیں جو ہم اپنے نوٹ میں ظاہر کر رہے ہیں۔

اس سے تو کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا کہ امور دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل واجب الاتباع ہے اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے وہ حضور کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ طریق نبوی کے علم کی کیا کیا صورتیں ہیں، اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے۔

جو باتیں حضور سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصّوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جو تواتر کے ساتھ آیا ہے، خواہ وہ تواتر عملی ہو یا خبری۔ دوسرا حصہ وہ جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا۔ ان میں سے پہلے حصہ کے متعلق تمام امت کا اتفاق ہے کہ وہ یقینی ہے، اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے، کیونکہ تواتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے۔ رہا دوسرا حصہ تو اصولاً اس کو سب ظنّی مانتے ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ مفید علم ضروری ہے مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ اس اصولی ظنیت کی بنا پر اخبار آحاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ ہم اس مسئلہ میں تین مختلف مسلک ہیں۔

ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنّی ہے، اس لیے وہ من حیث الکل رد کر دینے کے قابل ہے، کیونکہ جو چیز ظنّی ہے وہ ثابت شدہ نہیں، اور جو ثابت شدہ نہیں لائق اتباع نہیں۔ مگر تھوڑے سے غور و خوض

کے بعد اس مسلک کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی مظنون چیز "ثابت شدہ" نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا "ثابت شدہ" نہ ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کر دینے کے قابل ہو؟ اگر اتباع کے لیے یقینی ہونا شرط ہے تو فرمائیے کہ "یقینیات" دنیا میں ہیں کتنے؟ آپ کی زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ صرف یقینیات کی پیروی کرتے ہیں اور مظنونات کو من حیث الکل رد کر دیتے ہیں؟ تجزیہ و تحلیل کے چند ہی مدارج طے کر کے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے۔ مظنونات کو من حیث الکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے، اسی درجہ کی غلطی ان کو من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے۔ عقل سلیم کا اقتضا یہ ہے (اور اسی کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں انسان کرتا ہے) کہ تمام مظنونات کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے، بلکہ ان کے درمیان تمیز کی جائے، ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا جانچ کر دیکھا جائے، اور تحقیق کے مختلف ذرائع سے کام لے کر یہ دریافت کیا جائے کہ کونسی چیز "یقین" سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے؟ جو چیز بعید ہو اسے رد کر دو۔ جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرو۔ اور جو چیز قریب یا اقرب ہو، اس کو بلحاظ اس کے درجۂ قرب کے قبول کر لو۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات میں عمل کیا جاتا ہے، اور چونکہ ہمارا دین غیر معقول نہیں ہے، اس لیے اسی کی پیروی دین کے معاملات میں بھی کرنی چاہیے۔ کم از کم ہمیں تو قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جو اس اصول کو خلاف حق قرار دیتی ہو۔ جن آیات میں ظن پر چلنے والوں کی برائی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ظن کوئی گناہ ہے یا اس سے بالکلیہ اجتناب واجب ہے، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہے کہ جو ظن و تخمین، وحی کے خلاف ہو، یا جس کو وحی سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر اختیار کیا جائے وہ گمراہی کا سبب ہے۔

احادیث کو بالکلیہ رد کر دینے سے عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں

انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے، اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس و رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے اصولی احکام کی اصل اسپرٹ کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔ نیز اس میں یہ بھی خطرہ ہے کہ جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی، تو لامحالہ انفرادیت راہ پائے گی۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا، اور کوئی ایسی قوت باقی نہ رہے گی جو تفرق و انتشار اور اختلاف عمل کو انفرادیت کی آخری حدود تک پہنچنے سے روک سکتی ہو۔ مثال کے طور پر ایک نماز جمعہ ہی کو لے لیجیے جس پر تفصیلی بحث ابھی پچھلے مہینہ آپ کی نظر سے گذر چکی ہے۔ ہمارے پاس علم یقین کے جو ذرائع ہیں، ان میں سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ یعنی قرآن ہم کو صرف اتنی ہدایت دیتا ہے کہ "جب نماز جمعہ کے لیے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر دوڑ پڑو"۔ دوسرا ذریعہ یعنی عمل متواتر ہم کو اس سے تھوڑی دور آگے لے جاکر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ صرف اتنا علم ہم کو دیتا ہے کہ جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے، اس کے لیے جماعت شرط ہے، اس سے پہلے خطبہ ہونا چاہیے، اس کی رکعتیں دو ہیں، اور اس کے لیے اذن عام ضروری ہے۔ ان امور کے بعد جتنے عملی جزئیات ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن یا عمل متواتر سے ہم کو معلوم نہیں ہوتی۔ اب اگر اخبار آحاد کو بحیثیت مجموعی رد کر دینے کا اصول اختیار کیا جائے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا، اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی انحصاری حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلہ میں ترجیح دی جاسکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہو جائے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے جزئیات میں کتنی افراتفری برپا ہوگی، نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا، اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصد شریعت تک فوت ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اخبار آحاد سے جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہیں اور ان کی بنا پر بھی متعدد مذہب نکلتے ہیں۔ مگر اول تو ان میں مشکل پانچ سات

مذاہب نکلنے کی گنجائش ہے، اور پھر ان سے جتنے مذہب بھی نکلتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو کسی بالاتر اقتدار کی سند حاصل ہے جس کی قوت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس کا اتباع کرتی ہے۔ بخلاف اس کے اخبار آحاد کو بالکلیہ رد کرنے کے بعد بے شمار مذاہب کی گنجائش نکل آتی ہے، اور ان میں سے کسی مذہب کو بھی کوئی ایسی سند حاصل نہیں ہوتی جو زیادہ نہیں، دو ہی مسلمانوں کو کسی ایک جزئیہ میں ایک طریقہ پر جمع کر دے۔ نتیجہ اس کا بالکل ظاہر ہے۔ جمعہ کی قوت جامعہ ختم ہو کر رہ جائے گی اور اختلاف عمل اس مقصد ہی کا خاتمہ کر دے گا جس کے لیے اقامت جمعہ فرض کی گئی ہے۔

جمعہ کو ہم نے صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے نظام شرعی کو جو چیز ایک مستقل عملی نظام بناتی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے وہ وہی علم ہے جو اخبار آحاد سے ہم کو حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی، آپ کے اخلاق، آپ کی عادات، آپ کا طریق عبادت، آپ کا طرز تعلیم و تبلیغ، آپ کا طرز عدالت، آپ کے قانونی فیصلے، زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی ہدایات اور آپ کا طرز عمل، پھر آپ کے خلفاء اور صحابہ اور اہل بیت اور تابعین کے آثار یہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں، اور اسی نقشہ پر اسلام ایک مکمل نظام حیات بنتا ہے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ نہ قرآن ہے نہ تواتر۔ صرف اخبار آحاد ہی ہیں جو ہم تک معلومات اور ہدایات کا یہ عظیم الشان ذخیرہ پہنچاتی ہیں۔ ان کو مٹا دیجیے پھر اسلام محض ایک ڈھانچہ رہ جائے گا جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہوگا، جس کی شکل اور جس کے خط و خال کو جو شخص جس طرح چاہے گا بنائے گا۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی ایک نظام جماعت

قائم ہی نہ ہو سکیگا، کجا کہ کوئی ایسی تہذیب وجود میں آسکے جو اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی مخالفت آج وہی لوگ کر رہے ہیں جو دراصل اسلامی تہذیب کے نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے تعینات کی حدود میں اپنی اھوا اور خواہشات کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے اس لیے انہوں نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ اُس چیز ہی کو مٹادو جو اس نظام کی حدبندی کرتی ہے پھر ہم آزاد ہو جائیں گے کہ اسلام کے ڈھانچے پر جس طرح چاہیں گوشت پوست چڑھائیں، اور جیسی چاہیں اس کی شکل بنادیں۔

یہ لوگ احادیث کو مجموعی حیثیت سے مردود قرار دینے کے لیے اُن حدیثوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں جو باہم متعارض ہیں، یا جن میں انبیاء علیہم السلام پر طعن پایا جاتا ہے، یا جو صریح عقل کے خلاف ہیں یا قرآن کے خلاف نظر آتی ہیں۔ ان نمونہ کے افراد سے یہ لوگ پورے مجموعہ کے غلط اور قابل رد ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے چند افراد کی بدمعاشی سے پوری قوم کی بدمعاشی پر استدلال کیا جائے۔ جب ہر روایت بلحاظ متن اور بلحاظ اسناد دوسری روایت سے مختلف ہے تو ہر روایت کے متعلق جدا جدا تحقیق کرکے رائے قائم کرنی چاہیے کہ وہ قبول کرنے کے لائق ہے یا رد کرنے کے لائق۔ سب کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے لینا اور پورے مجموعہ کے متعلق ایک ہی رائے قائم کرنا کسی معقول انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ احادیث پر فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہوگا کہ جہاں ایک قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ہے جنہیں دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں، وہاں ایک کثیر تعداد ایسی حدیثوں کی بھی ہے جو حکمت کے جواہر سے لبریز ہیں، جن میں قانون اور اخلاق کے بہترین اصول پائے جاتے ہیں، جو اسلام کی حقیقت اور اس کے مصالح و حِکَم پر بہترین روشنی ڈالتی ہیں اور جن کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک رسول ہی کی حدیثیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر

یہ لوگ حق پرست اور انصاف پسند ہوں تو انہیں نظر آئے کہ محدثین کرام نے عہد رسالت اور عہد صحابہ کے اخبار و آثار جمع کرنے اور ان کو چھانٹنے اور ان کی حفاظت کرنے میں جو محنتیں کی ہیں جو دنیا کے کسی گروہ نے کسی دور کے حالات کے لیے نہیں کیں۔ انہوں نے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ ایسے ہیں کہ کسی دور گذشتہ کے حالات کی تحقیق کے لیے ان سے بہتر طریقے عقل انسانی نے آج تک دریافت نہیں کیے۔ تحقیق کے زیادہ سے زیادہ معتبر ذرائع جو انسان کے امکان میں ہیں وہ سب اس گروہ نے استعمال کیے ہیں اور ایسی سختی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ کسی دور تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت یہی چیز اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اس عظیم الشان خدمت میں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق شامل حال رہی ہے، اور جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے، اُسی نے اپنے آخری نبی کے نقوش قدم اور آثار ہدایت کی حفاظت کے لیے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

یہ تو اس گروہ کا حال تھا جو احادیث کی اصولی ظنیّت کی بنا پر انھیں بالکلیہ رد کر دینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھدیا ہے۔ ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کر دیے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلہ میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں، جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کر گئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں، ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں، رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کر گئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں، ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار

ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں، مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں، اور ان کی کھینچی ہوئی حد سے یک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی مخالفت جناب پرویز کرنا چاہتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی مخالفت بالکل جائز ہے۔

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلّم۔ یہ بھی مسلّم کہ نقد حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کارآمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیۃً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظنِّ غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظنِّ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا، اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمال کا جائز اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہے اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بلحاظ اسناد، دوسرے بلحاظ تفقہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کو جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلہ میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں ہے؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور

بدعقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال ہے یا معروف الحال؟ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کرکے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلاشبہہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر اس میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔

اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل۔ دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرّا نہ تھے نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا، اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکانِ عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے۔ حمّاد جیسے بزرگ تمام علمائے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں"۔ عطاء اور طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں بھی ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابوحنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھیے۔ اپنے زمانہ کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں ما رأیت قوماً انقض لعری الاسلام من اھل مکۃ۔ حالانکہ مکہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجہ کے لوگ ہیں۔ مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے" ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالانکہ مسروق سے وہ ملا تک نہیں"۔ ضحاک کو دیکھیے ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آکر صحابۂ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں"۔ سعید بن جبیر جیسے محتاط بزرگ ایک مسئلہ میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں، اور عکرمہ کے حق میں اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ لاتکذب علیّ کما کذب عکرمۃ علی ابن عباس۔ امام مالک کی جلالت

شان دیکھیے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھیے کہ ذلك دجال الدجاجلة۔ اس سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علماء عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ انزلوھم منزلة اھل الکتاب لاتصدقوھم ولا تکذبوھم۔ امام ابوحنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں۔ اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا نہ غسل جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش الماء من الماء کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن المبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں۔ ایک مرتبہ ان پر بھی ضد نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا"۔ یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی ابوعثمان النہدی، طاوس غرض اس عہد کے متعدد بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں، حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ لیس بثقة۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے۔ ابن عمر نے سنا کہ ابو ہریرہ وتر کو ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابو ہریرہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہ نے ایک موقع پر انس اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں۔ وہ تو اس زمانہ میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ وَشَاھِدٍ وَّمَشْھُوْدٍ کے معنی پوچھے گئے۔ انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن الزبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیدیا۔ عبادہ بن الصامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا، حالانکہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان ہی تھے، بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو، اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھیرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو۔ اور اس کی تمام روایتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظہ اور نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے، اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں اُن تمام جزئیات کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطۂ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ تو فن رجال کا حال ہے۔ اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلۂ اسناد ہے۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اُس کا ہم عصر تھا یا نہیں، ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں، اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اُسی سے سنی یا کسی اور سے سن لی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اُسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے، مگر لازم نہیں کہ ہر ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں وہ درحقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا ہو کہ بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مُرسل یا معضل یا منقطع ہیں، اور اس بنا پر پایۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ایسے ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو

کلیتہً صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے، مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کر لیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق تھا، اس لیے ان پر اخباری نقطۂ نظر غالب ہو گیا تھا، اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں۔ رہا فقیہانہ نقطۂ نظر تو وہ ان کے موضوعِ خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا، اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا، اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے حالانکہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں۔ اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالانکہ معنیً وہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے۔ مگر جو لوگ علوم شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطۂ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن اور اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہاء مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے۔ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے، اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمۂ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیے

ہیں جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں، یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں یہی حال امام مالک کا ہے۔ باوجودیکہ اخباری نقطۂ نظر ان پر زیادہ غالب ہے، مگر پھر بھی ان کے تفقّہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتویٰ دینے پر مجبور کیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ستر مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں؟ امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو حدیث صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا۔ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے، اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اسی کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کر چکے ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس ذوق کا مالک اسلام کا مزاج شناس ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے، اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے،

تو اُن میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبوی کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے، اور کونسی چیز سنتِ نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اُس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اُس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لیے کہ اس کی روح، روحِ محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے، مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لیے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چنانچہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان اجتہادیات میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیتہً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسلک کے ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ

اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک روشن مثال ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلہ میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کرسکتا ہے اور کر جاتا ہے اسی بنا پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو یہ ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کرو۔ خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کر کے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ لایحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا۔ امام زفر کا قول ہے انما ناخذ بالرای ما لم نجد الاثر فاذا جاء الاثر ترکنا الرأی واخذنا بالاثر۔ امام مالک کا ارشاد ہے انما انا بشر اخطئ و اصیب فانظروا فی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ امام شافعی کا بیان ہے کہ اذا صح الحدیث فاضربوا بقولی الحائط اور لا قول لاحد مع سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ غرض یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول روشن ہو جائے اس کے لیے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے، خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

نوٹ

[یہ استدراک یہاں تک پہنچ چکا تھا اور اس کا ایک معتدبہ حصہ پریس بھی جا چکا تھا کہ جناب پرویز کا عنایت نامہ وصول ہوا جس میں انہوں نے حسب وعدہ اپنے مدعا کی توضیح فرما دی ہے۔ ان کی خواہش کے مطابق سطور ذیل کو ان کے مضمون کے تتمہ کی حیثیت سے درج کیا جاتا ہے]

"میں یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ تصریحات بالا سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اُس گروہ کے مسلک کی تائید کر رہا ہوں جسے عام طور پر منکرین حدیث یا اہل قرآن کہا جاتا ہے میں اس سے پیشتر اپنے متعدد مضامین میں اس حقیقت کو بے نقاب کر چکا ہوں کہ اس فرقہ کو رسول کی حیثیت کے تعین میں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ وہ اس امر سے چشم پوشی کر رہے ہیں کہ قرآن کریم میں کیوں حصر کے ساتھ ارشاد ہے کہ ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنایا۔ ان کے نزدیک اگر قرآن کعبے کی چھت سے لٹکا دیا جاتا یا کسی چٹان پر منقوش ملجاتا تو بھی ایسا ہی تھا جیسا رسولؐ عربی کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ رسول کی حیثیت ان کے نزدیک آلۂ ابلاغ سے زیادہ نہیں۔ متشدد فی الحدیث طبقہ اگر اس افراط کی طرف چلا گیا کہ ہر قول منسوب الی الرسول کو قول رسول قرار دیکر واجب الاتباع تسلیم کرنے لگا تو دوسری طرف یہ اہل قرآن ہونے کے مدعی اس تفریط میں جا گرے کہ عمل رسول کو جو امت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے ایک بیکار محض شئے سمجھ کر قرآن کریم کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی جولانگاہ بنانے لگے۔ یہ بحث کہ تواتر کیا ہے، یہ کس طرح یقینی ہے، آج تواتر میں جو جزئی اختلافات پیدا ہو چکے ہیں ان کی وجوہات کیا ہیں؟ اور ان کی حیثیت کیا ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور بتوفیق باری تعالیٰ اس کی تشریح ایک الگ مضمون میں کر دی جائے گی۔ اس مقام پر صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ روایات کے متعلق جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ ان کو ہمیشہ قرآن کے تابع رہنا چاہیے کیونکہ جس نہج و اسلوب سے روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ ظنّی ہے یقینی نہیں ہے۔ برعکس اس کے قرآن یقینی ہے۔ اور جس کسوٹی پر روایات کو پرکھا گیا ہے وہ بجائے خویش ظنّی ہے۔ قرآن کی روشنی میں احادیث کو پرکھا جاتا تو بڑی حد تک ان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ باقی رہا اسوۂ حسنہ تو رسول پر ایمان کا مفہوم ہی یہی ہے کہ اس کو واجب الاتباع سمجھا جائے۔"

اسلام

جناب مولوی داؤد اکبر صاحب اصلاحی

یہ عجیب بات ہے کہ بعض الفاظ بہت شائع و ذائع ہوتے ہیں یا بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ ہر خاص و عام کے زبان زد ہوتے ہیں لیکن ان کی حقیقت بہت ہی زیادہ غامض و مستور رہا کرتی ہے۔ انہی میں سے لفظ اسلام بھی ہے۔ اس چھوٹے سے لفظ میں کتنی گہرائی ہے؟ اس کے باطن میں کیا کیا حقائق و رموز پوشیدہ ہیں، اور اس کے جمال میں کتنی دلکشی و دلفریبی ہے، اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس مختصر لفظ کی روحانیت دلوں میں گھر کر جائے لیکن رونا تو اسی کا ہے کہ اسکی روحانیت مدعیان دین فطرۃ نے ایسی کھوگئی ہے کہ سارے عالم اسلامی میں اگر چراغ لے کر ڈھونڈا جائے تو فیصدی شاذ ہی ایک دل اس دولت گرانمایہ سے معمور ملے گا۔ مدعیوں کی کمی نہیں اس لیے کہ آمنا و صدقنا کا دعویٰ ہر چہار جانب سے بابانگ دہل ہو رہا ہے لیکن اسلمنا اور اطعنا کے جذبہ سے خالی۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ امت مرحومہ کے فرزندوں نے اسلام کو ایک محدود چار دیواری میں محصور کر رکھا ہے۔ وہ اسلام کا طغرائے امتیاز اس سے زیادہ نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں جیسے نام رکھ لیں، گائے کا گوشت کھالیں، مساجد میں رسماً حاضری دیا کریں۔ لیکن کیا لفظ اسلام کا یہی محدود مفہوم قرآن پاک سے بھی نکلتا ہے؟۔

قبل اس کے کہ اسلام کے آثار و نتائج کی تفصیل بیان کی جائے مناسب ہوگا کہ اس کا مفہوم بیان کر دیا جائے تاکہ اس کے ثمرات و برکات سمجھنے میں آسانی ہو۔

اسلام کا مفہوم | لغت میں اسلام کے معنی "سر نہادن للطاعت" کے ہیں یعنی فرمانبرداری میں

سرجھکا دینا۔ اور اصطلاح قرآن میں اس سے وہ جذبہ مقصود ہے جو لوگوں میں طاعت و فدویت کا افسوں پھونک دے، جس سے انسان اپنی عزیز سے عزیز چیز بھی راہ خدا میں قربان کرنے سے دریغ نہ کرے، بلکہ ہمہ آن فدویت کا پتلا بنا رہے اگر جانی قربانی کا اشارہ ہو تو بے دریغ جام شہادت پینے کے لیے تیار ہو جائے اور اگر مال و جائداد مطلوب ہو تو اس میں بھی لیت و لعل نہ کرے۔ لیت و لعل اس راہ میں جرم عظیم ہے جو ہچکچایا گو کہ وہ سب کچھ قربان کر دے، روح اسلام سے خالی متصور ہوگا۔ اس لیے کہ اس راہ میں کوئی پیشکش بھی بغیر خلوص کے شرف قبولیت نہیں حاصل کر سکتی۔ الغرض اسلام کی بہترین تعبیر دوسرے لفظوں میں فدویت کاملہ و طاعت خالصہ ہے

اسلام کی اس تشریح کے بعد اب ہم اس کے آثار و نتائج بیان کریں گے

اسلام فطرت کائنات ہے ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام نام ہے فدویت کاملہ و طاعت خالصہ کا، اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس جذبۂ فطری سے صرف انسان ہی بہرہ مند ہے یا اور مخلوقات الٰہی بھی اس میں برابر کی شریک ہیں؟ میرے خیال میں ہر وہ شخص جس میں تفکر و ادراک کا جوہر ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ساری کائنات میں ہم آہنگی و توافق ہے، یہ سارا کا سارا نظام کسی غیر مرئی طاقت کے سامنے جبین نیاز خم کیے ہوئے ہے لیکن ہر ایک کا طرز عبودیت جداگانہ ہے۔ زمین اپنے دفائن اگلتی ہے آسمان پانی کا انتظام کرتا ہے، درخت پھل لاتا ہے، سورج اور چاند موسم کو خوش گوار بناتے ہیں، الغرض یہ پوری کائنات اپنی اپنی ڈیوٹیوں میں لگی ہوئی ہیں۔ یہی ان کی عبادت ہے اور انسان کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ اپنا ساز چھیڑے تاکہ دونوں کے نغموں سے دنیا معمور ہو جائے۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ	دیکھتے نہیں کہ جتنی مخلوقات آسمان اور زمین میں
وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ	ہیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پرند پر پھیلائے سب

صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۔ (النور: ۴۱) اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے سے واقف ہیں اور اللہ جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے خوب واقف ہے۔

اسی حقیقت کو ایک دوسری آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل: ۵) کوئی بھی نہیں (مخلوقات میں سے) مگر یہ کہ اس کی تسبیح میں مشغول ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

اسی حقیقت کو ایک اور مقام پر یوں دہرایا ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (الرعد: ۲) اور جس قدر مخلوقات آسمان و زمین میں ہیں چار و ناچار سب کی سب اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں صبح اور شام۔

الغرض قرآن کی آیات کے استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے جذبۂ فطری سے اس کائنات کا ذرہ ذرہ معمور ہے، یہ پورا نظام رزاق عالم کی تسبیح و تقدیس میں نغمہ سنج ہے، کسی کو بھی اس کی بندگی سے مجال انکار نہیں، سب اس کی کبریائی و برتری کا راگ الاپ رہے ہیں۔

يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کی تسبیح کرتا ہے اور وہ قوت والا اور حکیم ہے۔

تفصیل بالا سے یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی ہو گی کہ اسلام فطرت کائنات ہے زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اسی کا نغمہ ریز ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ یہی دین و مذہب کی روح بھی ہے، اس کے بغیر تمام ملل و ادیان بے معنی ہیں۔

اسلام مع شرائع ہے | دنیا میں آج تک جتنے صحیفے نازل ہوئے ہیں ہر ایک کی دعوت و تلقین کا مرکز اسلام ہی رہا ہے۔ اسی حقیقت کو کہیں سیاست کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہیں حلم و عفو

کا رنگ غالب ہے، اور اسی کو خاتم الرسل (علیہ الف الف تحیۃ) نے ایک تیسرے رنگ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کی دلکشی حد کو پہنچ گئی چنانچہ قرآن پاک نے اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۔ فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ۔ الآیۃ ... (آل عمران : ۲)	دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی ہے اور اہل کتاب جو اختلاف میں پڑ گئے تو یہ اس وقت ہوا جبکہ علم ان کے پاس آچکا تھا اور یہ آپس کی ضد سے ہوا۔ خدا کی آیات سے انکار جو کوئی بھی کرے گا اللہ کو اس کا حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی پس اگر اس پر بھی تم سے وہ جھگڑا کریں تو کہدو کہ میں اور میرے ساتھیوں (صحابہؓ) نے تو خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اہل کتاب اور امیوں سے کہو کہ تم اسلام لاتے ہو (یا نہیں) پھر اگر اسلام لائیں تو ضرور وہ راہ یاب ہیں ...

مذکورہ بالا آیت کی ابتدا و انتہا کے ٹکڑوں پر غور کیجئے تو دو حقیقتوں کا انکشاف ہوگا۔

(۱) تمام ملل و ادیان کی اساس اسلام رہا ہے یعنی آج تک جتنے مذاہب آئے ہیں ایک ایک کی روح رواں اسلام ہی تھا۔

(۲) چونکہ ہمیشہ سے یہی جملہ شرائع کا مصدر رہا ہے اسی لیے قرآن نے بھی اسی کا لوگوں سے مطالبہ کیا اور بآواز بلند کہا کہ جو اس حقیقت کو تسلیم کرے گا خدا دین و دنیا دونوں میں اسے بلند و برتر کرے گا۔ اور جو اس سے کترا جائیگا خدا کی زمین اس پر تنگ ہو جائیگی اور ہر طرح کی ذلت و نکبت کا مورد ہوگا تاریخ شاہد ہے کہ چند نفوس نے اسی شراب کو پی کر تمام جبابرہ و قیاصرہ کی مستحکم حکومتوں کو پارہ پارہ کیا اور ان کی جگہ خلافت قائم کی، اور تمام باطل قوانین مٹا کر عادلانہ ضوابط جاری کیے

اور ارض الٰہی کو ہر طرح کے ظلم وستم سے پاک کر دیا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ اسلام جملہ شرائع کی روح ہے، سوال ہوتا ہے کہ آخر یہ چیز پیدا کس طرح ہوتی ہے؟ قرآن پاک نے اس سوال کا متعدد جگہ جواب دیا ہے۔

اسلام کا مصدر دل اور عقل انسانی زندگی کے چراغ ہیں۔ یہ جن لوگوں میں روشن ہوتے ہیں ان کے عقائد میں استحکام اور اعمال میں درستگی پائی جاتی ہے اور جو لوگ فطرت کے اس چراغ کو گل کر لیتے ہیں ان کے عقائد میں تذبذب اور اعمال میں عدم توازن پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے فاقدین بصیرت کو مردہ سے تعبیر کیا ہے اور صاحب نور و ہدایت کو حیات و جاوید والا قرار دیا ہے۔ ذیل کی آیت اس بارہ میں فیصلہ کن ہے،

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (الانعام) دعوت حق کان رکھنے والے ہی سنیں گے رہے مردے انھیں خدا اٹھائے گا پھر اس کے پاس پلٹائے جائینگے

مذکورہ بالا آیت میں تصریح ہے کہ حق و رشد کی دعوت پر وہی لوگ لبیک کہتے ہیں جن کی عقل و فکر ہر طرح کی کثافتوں سے مجلّی اور جن کا دل تمام بیماریوں سے پاک ہوتا ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ اسلام کا منبع دل اور عقل ہے ایک نظر اس جماعت قدسی کے مذہب پر بھی ڈال لینی چاہیے جنہوں نے مختلف وقتوں میں خدا کا پیام دنیا کو پہنچایا ہے اور جن کی زندگی کا مدعا محض حق و صداقت کی نشر و اشاعت تھا وہ انبیا علیہم السلام کی مقدس جماعت ہے۔ خدا کی اس محبوب جماعت نے کلمۂ حق کی خاطر جو قربانیاں کی ہیں وہ نہایت حیرت انگیز ہیں۔ ممکن ہے مادہ پرست حضرات اسے اساطیر الاولین سمجھیں لیکن یہ ان کی جہالت ہوگی، اس لیے کہ یہ تو وہ حقائق ثابتہ ہیں جن کا انکار ممکن ہی نہیں۔

انبیا علیہم السلام کا مذہب اسلام تھا اس میں شک نہیں کہ انبیا علیہم السلام کی مقدس جماعت کا سلسلہ

بڑے ہی اہم مقصد کے لیے ہوا تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی مسلسل قربانیوں کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ان کی حیات طیبہ کا ایک ایک عمل فدویت کے اثر میں ڈوبا ہوا ملے گا۔ وہ رزق کے طالب تھے تو اس لیے کہ خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ قربانی کر سکیں وہ نکاح کرتے تھے تو اس لیے کہ اپنی اولاد میں دین خدا کے نور کو روشن کریں اور اس کو پھیلانے والی جماعت وجود میں لائیں۔ یوں تو اس جماعت قدسی کا ہر ایک فرد اسلام و فدویت میں آپ ہی اپنا نظیر تھا مگر حضرت خلیل اللہ کی پوری حیات طیبہ مسلسل قربانیوں سے لبریز ہے بالخصوص حضرت ابراہیم کی وہ فدویت ہمیشہ یادگار رہے گی جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کا واقعہ ہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ تاریخ کا وہ مشہور کارنامہ ہے جسے دنیا کبھی نہیں بھول سکتی اور ہمیشہ ہمیش اس کی برسی منائے گی۔ اس لیے کہ اس میں زندگی کا فلسفہ مضمر ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو بڑی بڑی دعاؤں اور سماجتوں کے بعد اولاد ملی تھی۔ وہ بھی بڑھاپے میں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی اولاد کتنی پیاری ہو گی؟ ابھی حضرت اسمٰعیل کی ولادت پر چند ہی سال گذرتے ہیں کہ خواب میں آپ اپنی محبوب اولاد کی قربانی کا اشارہ پاتے ہیں۔ گو کہ خواب میں تاویل کی گنجائش بھی تھی مگر یہ قتیلان حق کے مسلک کے خلاف ہے اس لیے آپ بلاںیت و لعل اپنی اسی چہیتی اولاد پر چھری چلانے کے لیے آمادہ ہو گئے جو آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور بڑھاپے کی لکڑی تھی۔ خیر یہ تو بوڑھے باپ کی کرامات ہیں لیکن تعجب ہے حضرت اسمٰعیل کی عزیمت و فدویت پر، اور آپ کا یہ قول تو ہمیشہ ہمیشہ دنیا کو استقامت کا سبق دیتا رہے گا کہ "اِفعَل مَا تُؤمَرُ"، یہ جملہ گو بہت مختصر ہے مگر حقیقت میں اسلام کی تعبیر یہی ہے چنانچہ جب باپ بیٹا امر خداوندی بجا لانے کے لیے تیار ہو گئے اور قریب تھا کہ حضرت ابراہیم کی چھری محبوب اولاد کی گردن پر چل جائے فرشتۂ غیب نے کمال فدویت و للّٰہیت کی خوشخبری ان

الفاظ میں سنائی "قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ"

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم کی قربانی کا واقعہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑوں بڑوں کے قدم میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس مجسمۂ اسلام نے اپنے تمام جذبات و عواطف کو امر الٰہی پر بھینٹ چڑھا دیا اور حقیقت میں شہید حق (اسمٰعیل) کی گردن پر چھری چلانے کے لیے ہاتھ کو حرکت نہیں دی بلکہ موانع فدویت کے استیصال کے لیے ہاتھ کو جنبش دی۔

اب ذرا ایک نظر اس جماعت پر بھی ڈال لینی چاہیے جو خیر الامم سے معروف ہے اور جو بانیٔ اسلام کی دعا میں مُسلمہ سے موسوم ہے۔

امت محمدیہ کا اسلام حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے اپنے لیے اور اپنی ذریت میں سے ایک جماعت کے لیے سراپا اسلام وطاعت کی دعا کی تھی تفصیل بالا سے ظاہر ہے کہ دونوں برگزیدہ ہستیاں اس کڑے سے کڑے امتحان میں پورے طور پر کامیاب ہوئیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت جس کی اسلامیت کے لیے آپ نے دعا کی تھی اس نے آخر کونسی قربانی کی؟ اور اگر اس طرح کی کوئی قربانی نہ کی تھی تو پھر اس بلند ترین خطاب کی کیسے مستحق ہوگئی ہمارے نزدیک قربانی و ایثار کی جو مثال حضرت ابراہیم نے پیش کی تھی غلامان محمد بھی آپ کے اسوہ پر چلے، غزوۂ بدر میں تو ہو بہو وہی نقشہ پیش آیا۔ جگر کے ٹکڑے آمنے سامنے تھے۔ باپ اگر کافر ہے تو بیٹا مسلمان ہے اور دینی جوش نے اسے ایسا مست کر دیا ہے کہ تمام مادی علائق کاٹ کر بے دردی سے اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے یہ اسی فدویت کاملہ کی تاسی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ یہی نہیں بلکہ امت محمدیہ کی زندگی کا مقصد ہی قرآن نے فدویت قرار دیا ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ — کہدے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اس رب العالمین کے لیے

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، (الانعام ۲۰) — ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھکو ایسا ہی حکم دیا گیا ہے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار ہوں

مذکورۂ بالا آیات اس بارہ میں فیصلہ کن ہیں اسی لیے اس جذبہ کی آبیاری کے لیے اسلام نے قربانی کو ضروری قرار دیا ہے۔

ایمان کے ساتھ ساتھ تمغۂ اسلام بھی ضروری ہے

قرآن پاک کی بے شمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے لیے اعمال صالحہ کا ظہور ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان بے معنی ہے چنانچہ اعراب کے دعوی ایمان کو ناقص ٹھیرایا۔ فرمایا۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (حجرات: ۲)

اعراب کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے ہاں کہو کہ ہم مسلمان ہوگئے اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گذر تک بھی نہیں ہوا اور اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو تو اللہ تمہارے عملوں میں سے کسی طرح کی کاٹ چھانٹ نہیں کرے گا ضرور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

آثار اسلام

ایمان و اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور اسلام کا اعمال سے ان میں سے پہلے کی روحانیت جتنی زیادہ تیز ہوگی اسی قدر جذبۂ اسلام کی اسپرٹ زیادہ ہوگی قرن اوّل کے لوگوں میں یہ دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ خدا کے سامنے جھک کر تمام طاقتوں سے بے نیاز ہوگئے تھے باطل قوتیں گو کہ بہت زور شور سے ان کے روحانی وظاہری اجتماع پر حملہ آور ہوئیں مگر تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ پسپا ہوئیں۔ باطل پرست دنیا نے ان کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان کی کوئی تدبیر کارگر

ہوئی؟ تاریخ کے صفحات سے گو کہ مسلمانوں کے کارنامے مٹا دینے کی کوشش کی گئی لیکن یہ تو وہ حقائق ثابتہ ہیں جن کا انکار ممکن ہی نہیں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مومن ذبیح ہوتا ہے قرآن مجید کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سراپا اسلام وطاعت ہوتا ہے چنانچہ ذیل کی آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ - اَلتَّائِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللہِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (التوبہ ۱۴)

خدانے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال (اس وعدہ پر) خرید لئے ہیں کہ ان کے بدلے ان کو جنت ملے گی یہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں مارتے ہیں اور آپ بھی مارے جاتے ہیں یہ خدا کا پکا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اللہ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں، اور خدا سے بڑھ کر کون اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے۔ تو اپنے سودے کی جو تم نے خدا کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے تو بہ کرنے والے عبادت گذار حمد کرنے والے سفر کرنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیک کام کی صلاح دینے والے اور بُرے کام سے منع کرنے والے اور حدود الٰہی کی محافظت کرنے والے۔ اور اے پیغمبر مومنین کو خوش خبری سنادو۔

مذکورہ بالا آیات سے مومنین کی گوناگوں خصوصیات ٹپکتی ہیں لیکن ہر ایک کی روح رواں

جذبۂ اسلام و فدویت ہی ہے۔

(۱) مومن اپنی جان و مال کو خدا کی دین سمجھتا ہے اور جلد از جلد اسے ادا کر کے سبکدوشی کا متمنی ہوتا ہے۔

(۲) سراپا اسلام و طاعت ہوتا ہے حق کے لیے اپنی گردن کٹانا باعث فخر و مباہات تصور کرتا ہے

(۳) دفع منکرین میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کرنا اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرتا ہے اور دنیا میں امن و امان پھیلانے کے لیے ہر طرح کی قربانی کا جذبہ اس میں موجزن ہوتا ہے۔

(۴) حدود الٰہی کی حفاظت میں ہر طرح کی مصیبتیں انگیز کرنے کے لیے ہمہ آن مستعد و کمربستہ ہوتا ہے کسی مادی مانع کی اسے ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہوتی۔ بلکہ جوں جوں موانع ہمت شکن ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ دفعِ باطل میں زور و قوت آتی ہے۔

معیار برتری اسلام ہے | یہ تو غالباً سب کو تسلیم ہے کہ مذاہب کی جان اسلام و فدویت ہے اس کے بغیر تمام ادیان بے حقیقت سے معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی دعوت کا نچوڑ بھی یہی ہے لیکن جب اہل کتاب کی روحانیت پر مادیت کا غلبہ ہوا تو انھوں نے بہت سی بے بنیاد باتیں اپنی کتاب میں بڑھا دیں اور انھیں پر پھولے نہ سمائے لیکن جب آخری شریعت آئی تو اس نے ان کے تمام مکر و فریب کو طشت از بام کر دیا مثلاً وہ کہتے کہ جنت ہماری میراث ہے ہم خدا کے چہیتے ہیں جو زمین پر ہم باندھیں گے آسمان پر بھی باندھا جائیگا اور جو زمین پر کھولیں گے آسمان پر بھی کھولا جائے گا لیکن قرآن نے بہ بانگ دہل کہا کہ یہ من گھڑت باتیں ہیں جنھیں دین و مذہب سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اپنے اندر اسلام و فدویت کا جذبہ پیدا کرو اس کے بغیر نجات کا دروازہ کبھی نہیں کھلنے کا۔ فرمایا۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرہ: ۱۱۲)

لیکن ہاں جس نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکو کار بھی ہے تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے پروردگار کے یہاں ہے اور ایسے لوگوں پر نہ خوف طاری ہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے۔

رسائل و مسائل

نماز اور خطبہ جمعہ کی زبان

۱۔ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ امام اعظم یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اجتہاد تھا کہ نماز عجمی زبان میں پڑھنا جائز ہے؟ اگر ایسا تھا تو کیا علماء دین امام صاحب کے اس اجتہاد پر از سر نو غور فرما کر نماز کے کسی عجمی زبان میں پڑھے جانے کی بابت جواز یا عدم جواز کا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

(۲) آیۂ کریمہ "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" میں بحالت سکر نماز پڑھنے کی نہی فرمائی گئی ہے۔ اور اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ ایسی حالت میں انسان جو کچھ کہتا ہے اس کو سمجھتا نہیں اس سے ثابت ہوا کہ نماز کی صحت کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کو پڑھنے والا سمجھے بھی۔ اس لیے اگر کوئی شخص اپنی مادری زبان میں فریضۂ نماز کو ادا کرتا ہے اور جو کچھ وہ اس نماز میں پڑھتا ہے اس کے ایک ایک لفظ کو سمجھتا ہے تو کونسی وجہ ہے کہ اس کی ایسی نماز جائز اور مقبول نہ ہو؟

(۳) آیا علمائے کرام کے نزدیک عیدین اور جمعہ کا خطبہ مخاطبین کی مادری زبان میں دیا جانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ کہا جائے گا کہ عیدین اور جمعہ کا خطبہ عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں دیا جانا سنت نبوی کے خلاف ہے اس لیے ناجائز ہے۔ لیکن سنت نبوی یہ تھی کہ ایسے خطبہ کے دوران میں جو کچھ حضور پرنور کی زبان فیض ترجمان سے

نکلے اس کو سامعین سُنیں اور سمجھیں اور اس میں جو کچھ اوامر و نواہی ہوں اُن پر کاربند ہونے کی کوشش کریں اور جو کچھ حکم اور نصائح ہوں ان سے سبق آموز ہوں۔ وہ صورت جس میں سامعین میں سے ۹۹ فیصدی خطبہ کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے ہوں وہ ان اوامر و نواہی سے جو خطبہ میں بیان کیے جاویں کیونکر کسی قسم کا استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ایسا خطبہ کیونکر سنت نبوی کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے؟

عیدین اور جمعہ کے خطبے کو عربی زبان تک محدود رکھنے سے جو مواقع شارع اسلام نے اوامر و نواہی شرعیہ کی اشاعت کے کافۃ المسلمین کے لیے پیدا فرمائے ہیں ان کا سد باب ہوتا ہے یا نہیں اور خطیب کا خطبہ ایسی صورت میں ایک فعل عبث ہو جاتا ہے یا نہیں جبکہ اس کے مفہوم کو سامعین میں سے کوئی یا اکثر نہیں سمجھتے۔

میں جانتا ہوں کہ بعض لوگ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں "علمی" کی اردو کی نظمیں پڑھتے ہیں مگر میرا یہ خیال ہے کہ ان کا یہ عمل علما کے متفقہ طریقہ کے خلاف ہے اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ علماء اس مسئلہ کے متعلق خاص طور پر توجہ فرما کر اپنا فتویٰ عوام کے فائدے کے لیے صادر فرمائیں۔ فقط

محمد ذکار اللہ خان۔ از دتیا۔

ترجمان القرآن۔ یہ درحقیقت ایک استفتار ہے جس کے اصل مخاطب علمار کرام ہیں۔

اس رسالہ کے اڈیٹر کو نہ منصب افتار حاصل ہے، نہ وہ اس کا اہل ہے کہ مسائل شرعیہ میں فتوی دینے کی ذمہ داری اٹھا سکے، مگر سائل محترم نے حسن ظن سے کام لے کر اس سے بھی خواہش کی ہے کہ اپنی تحقیق بیان کرے، لہذا مختصر طور پر امور مسئول عنہا کے متعلق احکام شریعت کی توضیح کی جاتی ہے۔ اس توضیح کی حیثیت ہرگز کسی فتوے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف اس غرض کے لیے ہے کہ حضرات علماء ان معروضات پر غور فرمائیں اور اگر مبنی بر صواب پائیں تو قبول کر لیں۔

چند ضروری مقدمات: قبل اس کے کہ اصل بحث پر کچھ عرض کیا جائے، چند مقدمات ذہن نشین کر لیجیے کہ ان سے ہمارے آئندہ بیانات کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

(۱) یہ امر مسلم ہے کہ شریعت حقہ کی بنیاد حکمت اور مصلحت پر قائم ہے۔ شارع حکیم نے کوئی حکم بھی بے معنی اور بے مقصد نہیں دیا ہے، نہ کسی حکم کو بجا لانے کا طریقہ مقرر کرنے میں کہیں حکمت و مصلحت کو نظر انداز کیا ہے۔ جب یہ مسلم ہے، تو لا محالہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت کا صحیح اتباع تفقہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ کسی کام کا حکم دینے یا کسی فعل سے منع کرنے میں شارع کے پیش نظر کونسا مقصد اور کونسی مصلحت ہے، اور جو شخص یہ نہیں سمجھتا کہ کسی حکم کی بجا آوری کے لیے شارع نے جو عملی صورت مقرر کی ہے اس خاص صورت میں کیا حکمت مدنظر ہے، اور اصل مقصد کی تحصیل میں کون کونسا جزئیہ کس کس طرح مددگار ہوتا ہے، اس کے لیے زندگی کے مختلف احوال میں شریعت کا صحیح اتباع کرنا بہت مشکل بلکہ تقریباً محال ہوگا۔ اس کے پاس شریعت کا صرف جسم ہوگا، اس کی روح نہ ہوگی۔ وہ محض استخوان کا مالک ہوگا، مغز کو نہ پا سکے گا۔ بعض حالات میں نہیں بلکہ اکثر حالات میں وہ اس طرح عمل کرے گا کہ بظاہر تو وہ شارع کے احکام کی پیروی ہوگی، مگر درحقیقت شارع کے اصلی مقاصد فوت ہو جائیں گے، کیونکہ اس کی نگاہ احکام کی مجرد عملی صورتوں اور ان کے جزئیات پر ہوگی۔ ان احکام میں جو مصالح اور مقاصد پوشیدہ ہیں وہ اس کی نظر سے اوجھل ہی رہیں گے، پھر کس طرح وہ مقاصد و مصالح کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر و تبدل کر سکے گا؟

(۲) یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام ازمنہ اور تمام احوال میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالت اور عہد

صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکام اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کے جزئیات میں کسی قسم کا ردو بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روح اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ ایک موٹی سی مثال لے لیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے لیے سورج کی حرکت کے لحاظ سے اوقات مقرر فرمائے ہیں اس لیے کہ عرب اور ربع مسکون کے بیشتر حصوں کے لیے تعین اوقات کی یہی صورت مناسب ہے لیکن اگر کوئی شخص قطبین کے قریب رہنے والوں کے لیے بھی نمازوں کے اوقات معین کرنے میں وہی سورج کے طلوع و غروب اور سایہ کے اتار چڑھاؤ کا لحاظ کرے تو بظاہر یہ شارع کے منصوص احکام کی حرف بحرف پیروی ہو گی، مگر درحقیقت اس سے شارع کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اس کا شمار خلاف ورزی احکام میں ہو گا۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ ترک صلوٰۃ اور اسقاط فرض ہے پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار، صراحۃ النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے، اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیر احوال کے ساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصول تشریع پر مبنی اور اس کے طرز عمل سے اقرب ہو۔

(۴) مگر تفقہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان محض اپنی عقل و فہم کی پیروی کرنے لگے اور اس کے پیچھے پیچھے جدھر چاہے نکل جائے خواہ وہ حدود شریعت سے متجاوز ہی کیوں نہ ہو۔ اس قسم کی عقل پرستی وہ چیز نہیں ہے جس کو اسلام کی اصطلاح میں "تفقہ" کہتے ہیں، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآن میں اتباع ہوا کہا گیا ہے ہوا پرستی کی لازمی خصوصیت افراط پسندی ہے، اور اسلامی "تفقہ" کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال اور توازن ہے۔ ہوا پرست ہر معاملہ میں کسی ایک مصلحت یا ایک فائدہ کا ایسا شیدائی بن جاتا ہے کہ اس کی

خاطر دوسرے مصالح اور فوائد سے آنکھیں بند کرلیتا ہے بخلاف اس کے تفقہ اسلامی تمام مصالح اور فوائد کا مناسب لحاظ کرتا ہے، اور کسی مصلحت کو اگر نظر انداز بھی کرتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ کوئی عظیم تر مصلحت اس چھوٹی مصلحت کی قربانی چاہتی ہو۔ پھر مصلحت اور مضرت کے معیار میں بھی اسلامی تفقہ اور ہوا پرستی کے درمیان اختلاف ہے۔ ہوا پرست اسلام کے معیار پر نہیں بلکہ اپنے رجحان طبع کے معیار پر مصلحت و مضرت کا تعین کرتا ہے اور مصالح میں سے بعض کو اہم اور بعض کو غیر اہم قرار دیتا ہے بخلاف اس کے اسلامی تفقہ کا مقتضا یہ ہے کہ آپ کی نظر اسلام کی نظر ہو۔ آپ اس چیز کو مصلحت سمجھیں جسے اسلام مصلحت سمجھتا ہے اور اس چیز کو مضرت سمجھیں جسے اسلام مضرت سمجھتا ہے، اور مختلف مصالح اور مضرات کے درجے مقرر کرنے میں وہی معیار مد نظر رکھیں جو اسلام کے پیش نظر ہے پس کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ مجرد عقل پرستی کا نام تفقہ ہے، اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی عقل کی پیروی میں شریعت کے جس حکم کو جس طرح چاہے بدل دے۔ ہرگز نہیں اور یقیناً نہیں۔ اسلامی تفقہ یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی نگاہ میں جس چیز کو مصلحت سمجھتے ہیں اس کی خاطر اُن بہت سی مصلحتوں کو قربان کر دیں جنہیں شارع نے اپنے احکام میں ملحوظ رکھا ہے، یا آپ بزعم خود جس مضرت کو اہم سمجھتے ہیں اس سے بچنے کے لیے ایسی بہت سی مضرتوں کو قبول کرلیں جن سے شارع آپ کو بچانا چاہتا ہے بلکہ اسلامی تفقہ یہ ہے کہ آپ شارع کی تمام مصلحتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان میں سے ایک ایک کو وہی اہمیت دیں جو خود شارع نے دی ہے، اور جزئیات میں تغیر و تبدل اس طور پر کریں کہ شارع کے قائم کئے ہوئے توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ یاد رکھیے کہ شارع کے تجویز کردہ طرز عمل میں تغیر صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب کہ تغیر احوال کی بنا پر اس کی پیروی سے کوئی ایسی مصلحت فوت ہوتی ہو جو آپ کے شخصی رجحان کے لحاظ سے نہیں بلکہ خود شارع کے نقطۂ نظر سے اہم ہو۔ پھر ایسی صورت میں بھی صرف

اس حد تک جزئی تغیر کیا جا سکتا ہے کہ اس اہم تر شرعی مصلحت کی حفاظت کے ساتھ دوسری شرعی مصلحتوں کو نقصان نہ پہنچے یا اگر پہنچے بھی تو وہ ایسی مصلحتیں ہوں جو شارع کی نگاہ میں نسبتۂ زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تربیت یافتہ بزرگوں کے عمل سے احکام کے استنباط میں ایک قاعدہ کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "شرعی عمل" اور "طبیعی یا عادی عمل" میں فرق کیا جائے۔ شرعی عمل سے مراد ایسا عمل ہے جو اس بنا پر اختیار کیا گیا ہو کہ شریعت کا منشا وہی خاص طرز عمل اختیار کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ اور طبیعی یا عادی عمل سے وہ طرز عمل مراد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اپنے شخصی وطبیعی رجحان یا اپنے خاص زمانے اور ملک کے اجتماعی حالات کے اقتضار سے اختیار کیا تھا۔ یہ دوسری قسم کا طرز عمل متعدد حیثیات سے ہمارے لیے سبق آموز اور موجب رشد و ہدایت ہو سکتا ہے، مگر اس سے شرعی احکام کا استنباط درست نہیں۔ دلیل شرعی صرف پہلی قسم ہی کا طرز عمل ہے۔ بعض معاملات میں ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہوتا ہے، حتٰی کہ ہر شخص سرسری نظر میں اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر بعض امور، خصوصاً دینی امور میں یہ دونوں طرز عمل اس درجہ مخلوط ہوتے ہیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں ایک قسم کے طرز عمل کو دوسری قسم کے طرز عمل کی حیثیت سے لینے اور اس سے غیر مناسب نتائج اخذ کرنے کی غلطی اکثر پیش آتی ہے۔ اور بڑے بڑوں کو پیش آئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی وقت میں رسول بھی تھے، ایک انسان بھی تھے ایک عرب بھی تھے۔ ایک خاص زمانہ اور خاص اجتماعی ماحول کے رہنے والے بھی تھے۔ آپ کے ہر فعل میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی، یہ سب حیثیتیں ایک ساتھ موجود تھیں۔ ان مختلف حیثیات کے مخلوط ہونے کی وجہ سے یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی فعل میں کونسا حصہ آپ کی حیثیت رسالت سے تعلق

رکھتا ہے تاکہ اسے حجت شرعی بنایا جائے۔ اور کونسا حصہ آپ کی دوسری حیثیات سے متعلق ہے جو حجت شرعی نہیں۔ اس سے زیادہ اختلاط حیثیات صحابہ کرام کے افعال میں ہے۔ ہمارے لیے ان کے عمل میں شرعی رہنمائی صرف اس حیثیت سے ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ تربیت پائی ہے اور آپ سے احکام شریعت کا براہ راست استفادہ کیا ہے۔ اس حیثیت کے علاوہ ان کی دوسری حیثیات جس قدر بھی ہیں وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں، بہرحال کسی شرعی ہدایت کی حامل نہیں۔ اب اُن کے افعال میں خصوصاً دینی افعال میں یہ تمیز کرنا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی ہدایت پر مبنی ہے، کونسی ان کی رائے اور اجتہاد پر، اور کونسی ان کے خاص شخصی اور زمانی و مکانی حالات پر۔ یہاں امتیاز کا ذریعہ ہمارے پاس صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور سنت کے وسیع اور غائر مطالعہ سے ہمارے اندر جو اسلامی بصیرت پیدا ہوتی ہے اس سے ہم شرعی عمل اور طبیعی وعادی عمل کے باریک فرق کو محسوس کرتے ہیں، اور ہمارا ذوق ہم کو بتاتا ہے کہ کونسی چیز طبیعت اسلام سے تعلق رکھتی ہے، اور کونسی اس سے غیر متعلق ہے، کونسی چیز مصالح شرعیہ کی حامل ہے اور کونسی نہیں، کونسی چیز اسلامی سسٹم کا ایک جزء ہے اور کونسی نہیں۔ اس باب میں اختلاف کی بھی کافی گنجائش ہے، کیونکہ ایک شخص کا ذوق اور اس کی بصیرت لازماً دوسرے شخص کے ذوق اور بصیرت سے بالکل مطابق نہیں ہو سکتی، اگرچہ ماخذ دونوں کا ایک ہی ہو۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ صرف وہی چیز "شرعی" ہے جس کو میری بصیرت شرعی کہہ رہی ہے، اور دوسرے شخص کی بصیرت جس کو "شرعی" کہتی ہے وہ قطعاً و یقیناً غلط ہے۔

ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد نماز اور خطبہ جمعہ کی زبان کے مسائل پر الگ الگ غور کیجیے۔ اس لیے کہ ان دونوں مسئلوں کی نوعیتیں باہم مختلف ہیں، اگرچہ بظاہر ایک نظر آتی ہیں۔

نماز کی زبان نماز کی زبان کے متعلق آج کل عام طور پر اُسی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔

جس کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے یعنی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تا وقتیکہ تم یہ نہ جانو کہ کیا کہہ رہے ہو) لیکن درحقیقت اس آیت سے استدلال درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حَتّٰى تَعْلَمُوْا فرمایا ہے، حَتّٰى تَفْقَهُوْا یا حَتّٰى تَفْهَمُوْا نہیں فرمایا۔ علم اور فقہ وفہم میں جو باریک فرق ہے اس کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ دوران نماز میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے کے معنی ومفہوم کو سمجھنا، اور ہر لفظ کے معنی کی طرف ملتفت رہنا ضروری ہے، اور جب تک یہ فہم اور التفات حاصل نہ ہو، نماز صحیح نہیں ہوتی حالانکہ یہ بداہتہً غلط ہے۔ اگر ایک عربی نہ جاننے والے کی نماز محض اس وجہ سے صحیح نہیں ہوسکتی کہ وہ نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے اسے نہیں سمجھتا، تو ایک عربی دان کی نماز بھی ایسی حالت میں درست نہ ہونی چاہیے جبکہ وہ سمجھ سمجھ کر نہ پڑھ رہا ہو، اور اول سے لے کر آخر تک پوری نماز میں ایک ایک لفظ کے معنی کی طرف ملتفت نہ ہو۔ ایسی کڑی شرط کے ساتھ تو شاید مشکل ہی سے کوئی شخص روزانہ پانچوں وقت کی نمازیں صحیح ادا کرسکتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی میں انسان پر ہر طرح کے حالات گزرتے ہیں، کبھی رنجیدہ ہوتا ہے، کبھی متفکر ہوتا ہے، کبھی کسی کام میں اس کا ذہن مشغول ہوتا ہے، کبھی غیر محسوس طور پر خیالات اور خطرات اس کے ذہن میں داخل ہوجاتے ہیں اور کافی دیر تک اس کو یہ شعور بھی نہیں ہوتا کہ میرا ذہن کدھر بھٹک گیا۔ اگر نماز کے لیے یہ شرط ہو کہ ان سب دماغی وقلبی کیفیات سے بالکل خالی ہوکر انسان پورے شعور اور التفات کے ساتھ کھڑا ہو تو نماز ادا کرنا ہی مشکل ہوجائے لیکن یہ وہ سختیاں ہیں جو انسان خود اپنی عقل سے اپنے لیے پیدا کرتا ہے۔ شارع نے اس پر ایسی سختی نہیں کی، کیونکہ وہ اس کی فطری کمزوریوں کو خوب جانتا ہے۔ اس نے سمجھ اور التفات اور استغراق اور خشوع وخضوع کو نماز کا کمال اور اس کا حسن ضرور قرار دیا ہے، اور اس کی خواہش یہی ہے کہ انسان کی نماز ایسی ہی کامل اور حسین ہو، لیکن اس نے ان چیزوں کو شرط نماز قرار

نہیں دیا کہ بغیر ان کے نماز درست ہی نہ ہو۔

آیت کا صحیح مفہوم | قرآن کی آیت پر غور کیجیے۔ اگر سمجھنا اور معانی کی طرف ملتفت ہونا ہی صحت نماز کے لیے ضروری تھا اور اسی بنا پر حالت سکر میں نماز سے دور رہنے کا حکم دیا گیا تھا، تو پھر سکر ہی میں کونسی خصوصیت تھی؟ یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ جب تم متفکر ہو تو نماز سے دور رہو۔ جب تمہیں رنج یا پریشانی یا کسی اور قسم کی ذہنی مشغولیت لاحق ہو تب بھی نماز کے پاس نہ آؤ۔ جب تمہیں محسوس ہو کہ دوران نماز میں تمہارے خیالات کسی اور طرف بھٹک گئے ہیں تب بھی نماز توڑ دو اور پھر سے شروع کرو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کوئی قید بھی نہیں لگائی بلکہ صرف حالت سُکر میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس حالت میں تم کو علم نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہے ہو! اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سُکر میں کسی اور قسم کی بے خبری ہوتی ہے جو عدمِ فہم اور عدم التفات سے ماسوٰی ہے۔ اس حالت میں انسان کو یہ بھی شعور نہیں رہتا کہ وہ عبادت کے لیے کھڑا ہوا ہے یا کسی اور کام کے لیے، قرآن پڑھ رہا ہے یا کچھ اور، قبلہ رخ بھی ہے یا نہیں۔ اس پر کچھ ایسی مدہوشی طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپے میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ قرآن پڑھتے پڑھتے کوئی شعر گانے لگے۔ یا خدا کا ذکر کرتے کرتے کچھ اور اول فول بک جائے۔ یا قبلہ رخ کھڑے کھڑے کسی دوسری طرف ڈھلک پڑے یا نماز پڑھتے پڑھتے بھول جائے کہ نماز پڑھ رہا ہوں اور ادھوری نماز چھوڑ کر کسی سے باتیں کرنے لگے یا مصلے پر سے کہیں چل کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا مقصد حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے دراصل ایسی ہی بے شعوری کی طرف اشارہ کرنا ہے اور مدعا یہ ہے کہ جب تم اپنی حماقت سے اپنے اوپر ایسی حالت طاری کر لو جس میں تم کو اپنی زبان اور اپنے دل و دماغ پر قابو ہی نہ رہتا ہو تو ہمارے دربار میں حاضر ہونے کی جرأت نہ کرو۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آیت مذکورۃ الصدر کا کوئی تعلق نماز کی زبان سے

نہیں ہے، اور اس سے یہ استدلال کرنا درست نہیں کہ نماز نادری زبان میں پڑھنا ضروری ہے جسے مصلی اچھی طرح سمجھتا ہو۔

ائمۂ مجتہدین کے اختلافات اب یہ سوال باقی رہ گیا کہ آیا نماز کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے؟ اور کیا غیر عربی میں نماز ناجائز ہے؟ اس سوال کا حل اپنے طریق پر عرض کرنے سے پہلے ہم ان اختلافات کو بیان کیے دیتے ہیں جو اس باب میں ائمۂ مجتہدین کے درمیان ہوئے ہیں، تاکہ مسئلہ کی صحیح شرعی حیثیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

امام اعظم کا مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہے کہ فارسی میں (اور فارسی کی کچھ خصوصیت نہیں[1]، ہر زبان میں) نماز پڑھنا یا خدا کا نام لے کر ذبح کرنا، یا اذان دینا (بشرطیکہ وہ غیر عربی اذان معروف ہو اور اس کو سن کر لوگ جان لیں کہ اذان ہے) جائز ہے خواہ ایسا کرنے والا عربی پڑھنے پر قادر ہو یا نہ ہو۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ یعنی وہ پچھلی کتابوں میں بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن اپنے موجودہ نظم کے ساتھ پچھلی کتابوں میں نہ تھا۔ پس لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ان کتابوں میں اپنے معنی کے اعتبار سے تھا اور جب وہ معنوی ہونے کے باوجود "قرآن" ہی تھا تو یہ ماننے میں کیا قباحت ہے کہ قرآن کا فارسی ترجمہ بھی معنیً قرآن ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا جائز ہے۔ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا (اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے) اس سے معلوم ہوا کہ اگر عجمی زبان میں بھی یہ معانی ادا کیے جاتے تب بھی وہ قرآن ہی ہوتا۔ مزید براں روایات میں آیا ہے کہ ایران

---

[1] ابوسعید البردعی نے امام صاحب کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ فارسی کے سوا کسی دوسری زبان میں پڑھنا درست نہیں لیکن کرخی نے لکھا ہے کہ امام اعظم کا صحیح مسلک یہ ہے کہ ہر زبان میں پڑھنا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں ویجوز بای لسان کان سوی الفارسیة هو الصحیح۔

کے نومسلموں نے سلمان فارسی سے درخواست کی تھی کہ سورۂ فاتحہ ہم کو فارسی میں لکھ دیجیے۔ چنانچہ انہوں نے لکھ دی اور وہ اس کو نمازوں میں پڑھتے رہے یہاں تک کہ جب ان کی زبانیں نرم ہو گئیں اور وہ عربی پڑھنے پر قادر ہو گئے تو انہوں نے عربی میں پڑھنی شروع کر دی۔ ان دلائل کی بنا پر امام صاحب کی رائے یہ ہے کہ اگر غیر عربی میں نماز پڑھی جائے تو ادا ہو جائے گی، مگر وہ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ سنت متوارثہ کے خلاف ہے۔ بلکہ ابوبکر رازی نے تو لکھا ہے کہ امام صاحب نے آخر میں اپنی اس رائے سے رجوع کر لیا تھا، اور امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کی رائے قبول کر لی تھی۔

صاحبین کا مذہب امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عربی پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو تو غیر عربی میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ ہاں اگر وہ عربی کا تلفظ کرنے پر قادر ہی نہ ہو تو غیر عربی میں پڑھ سکتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ نماز میں قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے (فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ) اور قرآن کے ترجمہ پر "قرآن" کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا جس نماز میں قرآن کے بجائے اس کا ترجمہ پڑھا جائے وہ نماز ہی نہ ہو گی۔ مگر جو شخص عربی کے تلفظ پر قادر ہی نہ ہو اس کے لیے مجبوری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے۔ ایسے شخص کی نماز بالکل اسی طرح ہو جائے گی جس طرح اس شخص کی نماز جو رکوع و سجود سے عاجز ہو اور اشارہ سے ادا کرے۔

امام شافعی کا مذہب امام شافعی کا ایک قول وہی ہے جو صاحبین کا اوپر مذکور ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جو شخص عربی تلفظ پر قادر نہ ہو وہ بغیر قرأت کے نماز ادا کرے۔ اگر اس نے فارسی ترجمہ پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ کلام اللہ کا ترجمہ کلام اللہ نہیں، کلام الناس ہے۔ اللہ کا کلام صرف عربی قرآن ہے، بقولہٖ تعالیٰ انا انزلناہ قرآنا عربیا [1]

[1] اس بحث کی تفصیلات کیلیے ملاحظہ ہو کتاب المبسوط للسرخسی جلد اول صفحہ ۳۷۔ و فتح القدیر و شرح العنایہ علی الہدایہ جزو اول ص ۱۹۹ تا ۲۰۱

مسئلہ کی پوری تحقیق ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سلف صالح کے پیش نظر سوال کی نوعیت صرف یہ تھی کہ اگر نماز غیر عربی میں پڑھی جائے تو آیا ہو بھی جائے گی یا نہیں؟ کسی نے کہا کہ ہو گی مگر مکروہ ہو گی کسی نے کہا کہ سرے سے ہو گی ہی نہیں۔ کسی نے کہا کہ عاجز کی نماز ہو جائے گی بالکل اس طرح جیسے معذور کی نماز اشارہ سے ہو جاتی ہے لیکن موجودہ زمانہ کے مجتہدین کے سامنے سوال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ وہ اس سوال پر اس حیثیت سے نگاہ ڈالتے ہیں کہ آیا غیر عربی داں کی نماز عربی میں ادا بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ اور آیا غیر عرب کے لیے عربی میں نماز اولیٰ ہے یا اپنی مادری زبان میں؟ اب چونکہ صورت مسئلہ بدل گئی ہے، لہٰذا جواب مسئلہ کی صورت بھی بدل جانی چاہیے۔

مصالح شرعیہ نماز کے لیے کونسی زبان انسب اور اولیٰ ہے؟ اس سوال کے صحیح حل کا انحصار ایک دوسرے سوال کے صحیح حل پر ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں نماز کی حیثیت کیا ہے۔ اور اس سے کون کونسے شرعی مصالح وابستہ ہیں؟ اس سے پہلے ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد محض فرد کی تہذیب نفس اور اس کا تزکیہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ افراد کو فرداً فرداً پاک اور متقی بنا کر دراصل ایک اعلیٰ درجہ کی صالح جماعت بنانا چاہتا ہے جو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے فرائض ادا کرے۔ اسی غرض کے لیے اس نے تمام عبادات اس طریقہ پر فرض کی ہیں کہ افراد میں رجوع الی اللہ کے ذریعہ سے تقویٰ کی روح پھونکنے کے ساتھ ساتھ ان کو صالحین کی ایک جماعت بھی بناتی چلی جائیں۔ اور ان عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے جو تہذیب نفس بھی کرتی ہے قرآنی ہدایات کی اشاعت بھی کرتی ہے قرآن کی حفاظت بھی کرتی ہے اور مسلمانوں کو ایک جماعت بھی بناتی ہے۔ نماز کی ان مختلف حیثیات اور اسلام کے ان متعدد مقاصد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز محض ایک بندے کی اپنے خدا سے مناجات ہی نہیں ہے، اور محض ایک ایک فرد میں الگ الگ روح تقویٰ پھونکنے کا ذریعہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ اسلام کا قوام بھی ہے اور انفرادی مصلحت سے

عظیم تر مصالح بھی اس سے وابستہ ہیں۔

اب دیکھیے کہ جہاں تک انفرادی مصالح کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے ضروری ہے کہ انسان نماز میں جو کچھ پڑھے، اس کو سمجھے بھی تاکہ تہذیب نفس اور تزکیۂ روح کا مقصد پوری طرح حاصل ہو سکے۔ اس غرض کے لیے نماز کا اُس زبان میں ہونا مفید ہوگا جسے مصلّی جانتا اور سمجھتا ہو لیکن انفرادی مصالح سے اہم تر جو مصالح شارع کے پیش نظر ہیں ان کو یہ چیز نقصان پہنچا دے گی۔

اولاً قرآن کی حفاظت کا عظیم الشان مقصد اس سے بڑی حد تک فوت ہو جائیگا جب لوگ قرآن کے ترجمہ کو بھی قرآن سمجھنے لگیں گے اور یہ خیال عام ہو جائیگا کہ عبادت اور تلاوت کے مقاصد کے لیے ترجمہ اصل کتاب کا قائم مقام ہے تو اصل کتاب سے اعتنا کم ہو جائے گا، اس کو یاد کرنے کا ذوق باقی نہ رہے گا۔ اور ترجمہ ہی کو عملاً بطورِ اصل لے لیا جائے گا۔

ثانیاً اصل کتاب اللہ سے بے اعتنائی اور تراجم کی طرف روز افزوں التفات کا نتیجہ دین کی خرابی کے سوا کچھ نہ ہوگا، کیونکہ ناقص اور باہم مختلف و متعارض ترجموں کے الگ الگ جماعتوں اور الگ الگ قوموں میں معتبر بن جانے سے اسلام کا انجام بھی وہی ہوگا جو مسیحیت اور یہودیت کا ہوا۔

ثالثاً اس سے امت کی وحدت کا خاتمہ ہو جائے گا اور اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنا پڑ جائے گی۔ ہر زبان بولنے والوں کی نمازیں اور جماعتیں الگ الگ ہوں گی۔ ایرانی عرب کے پیچھے نماز نہ پڑھے گا۔ اور ترک ہندیوں کی جماعت میں شریک نہ ہوگا۔ ایک ہی جگہ بنگالیوں اور مدراسیوں اور پنجابیوں کی جماعتیں لسانی قومیت کی بنیاد پر الگ الگ قائم ہوں گی، اور نماز کے ٹکڑے ہوتے ہی امت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

ان عظیم تر اجتماعی نقصانات سے بچنے کے لیے ناگزیر ہے کہ نماز کے لیے ایک ہی بین الملّی زبان ہو اور وہ وہی زبان ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ رہا انفرادی نقصان تو اس کو دو

کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ نماز کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کے لیے ایک ہی عبارت مقرر ہے۔ تکبیر، تسبیح، تسمیہ، تعوذ، سورۂ فاتحہ، تشہد، ان سب کا ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹہ میں بآسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ عام طور پر جو سورتیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی دس بارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اور بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ ان کے ترجمے یاد کر لینا بھی کچھ مشکل نہیں۔ اس کے بعد قرآن کی صرف لمبی لمبی سورتیں باقی رہ جاتی ہیں جو کبھی کبھار سورۂ فاتحہ کے ساتھ ملائی جاتی ہیں، سو اگر بعض یا بیشتر مصلی ان کو نہ سمجھیں تو یہ ایسی کونسی قباحت ہے جس سے بچنے کے لیے تمام اجتماعی مصالح کی قربانی گوارا کر لی جائے۔

دلائل شرعیہ مصالح اور حکم سے قطع نظر کر کے جب ہم منقولی احکام پر غور کرتے ہیں تو ہمیں امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک سب سے زیادہ صحیح نظر آتا ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بھی آخر کار اسی کی طرف رجوع فرمایا ہوگا۔

قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت کرو۔ یَا اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيلًا ۝ نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيلًا ۝ ۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۔۔۔۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۔ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

یہ تمام آیات نماز میں تلاوت قرآن کا حکم دیتی ہیں اور ان میں القرآن (الف لام عرفی کیساتھ) کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کا اطلاق ترجمہ قرآن پر نہ لغوی حیثیت سے ہوتا ہے نہ معنوی حیثیت سے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر تصریح ہے کہ اسم قرآن کا مسمّٰی صرف عربی قرآن ہے اور کلام اللہ

وہی ہے جو عربی الفاظ کے ساتھ خدا نے نازل فرمایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے جو معنی بیان کیے جائیں گے، خواہ وہ عربی ہی کیوں نہ ہوں، وہ نہ صرف یہ کہ قرآن نہ ہوں گے، بلکہ اس کے مثل بھی نہ ہوں گے۔ لہٰذا وہ کبھی قرآن کے قائم مقام ہو ہی نہیں سکتے۔ وَكَذٰلِكَ أَنزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ۔ إِنَّا أَنزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ۔ وَإِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ ۔ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلٰى أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ ۔

یہ تصریح بھی قرآن ہی میں ہے کہ تحریف سے حفاظت کا وعدہ صرف اس کتاب سے متعلق ہے جو خدا کے پاس سے نازل ہوئی ہے۔ انسانوں کے کیے ہوئے تراجم سے متعلق نہیں ہے ان میں ہر طرح سے تحریف کا دروازہ کھلا ہوا ہے، خواہ وہ ارادی تحریف ہو یا مترجمین کے عجز اور ان کے عدم فہم اور ان کی قلت علم کی بنا پر ہو۔ وَإِنَّهُ لَكِتٰبٌ عَزِيزٌ لَّا يَأْتِيهِ الْبٰطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۔ لہٰذا نماز میں قرآن کا ترجمہ پڑھنے والا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ لفظاً نہیں تو معنًی قرآن کی صحیح تلاوت کر رہا ہے۔

رجوع الی اللہ اور انابت اور خشیت جو نماز کی اصل جان ہے۔ اس کو پیدا کرنے کی خاصیت جیسی قرآنِ منزل من اللہ میں ہے ویسی کسی اور کلام میں نہ ہو سکتی ہے نہ پائی جاتی ہے، اس پر بھی خود قرآن شاہد ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتٰبًا مُّتَشٰبِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۔

ایسے صریح اور محکم شرعی دلائل کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بہت ہی مشکل ہے کہ جو نماز ترجمہ

قرآن پڑھ کر ادا کی جائے وہ درست ہو جاتی ہے۔ مگر وہ ہونا کیسا، ہم تو کہتے ہیں کہ وہ کسی درجہ میں بھی ادائے فرض کے لیے کافی نہیں۔ البتہ جیسا کہ صاحبین نے فرمایا ہے اس شخص کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے جو عربی تلفظ پر قادر ہی نہ ہو۔ اس کے حق میں یہی فتوی مناسب ہے کہ جب تک وہ عربی میں نماز پڑھنے کے قابل نہ ہو جائے۔ اس کا فریضہ غیر عربی کے ساتھ ادا ہو جائے گا، اس لیے کہ وہ قانون اضطرار کے تحت آجاتا ہے۔ (باقی)۔

کیا نجات کیلیے صرف کلمہ توحید کافی ہے؟

"ایک حدیث کے متعلق جناب سے تشفی مطلوب ہے۔

من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ اس حدیث میں ایمان بالرسل کے بغیر جنت کی بشارت دی گئی ہے حالانکہ قرآن میں ایمان بالرسل پر جس شدت سے تاکید ہے ظاہر ہے تاآنکہ کوئی ایمان بالرسل کے بغیر نہ راہ ہدایت پاسکتا ہے نہ فوز وفلاح۔ نہ آخرت کی زندگی میں اس کے لیے کوئی حصہ ہے۔ نیز اس حدیث میں عمل صالح کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ اگرچہ اعمال صالحہ جزو ایمان نہیں ہیں مگر قرآن کریم میں تو آخرت کی کامیابی وکامرانی انعام و اکرام اور جنت کی بشارت۔ اپنے صاحب ایمان اور صالح بندوں ہی کو دی گئی ہے جیسا کہ آیات ذیل سے واضح ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ... جَزَاۤؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ الاٰیۃ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ الاٰیۃ۔

وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ الاٰیۃ

ہماری سطح بین نظروں میں یہ حدیث قرآن کے خلاف واقع ہو رہی ہے۔ براہ کرم جناب اپنے تبحر علمی اور محققانہ نظر سے مستفید فرماکر مطمئن فرمائیں تو موجب صد ممنونیت۔

صفوۃ الرحمٰن نظام آباد۔

ترجمان القرآن سب سے پہلے یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے قرآن مجید میں بھی ایک جگہ فرمایا گیا ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	بے شک جن لوگوں نے کہا کہ خدا ہی ہمارا رب ہے،
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا	پھر اس (قول) پر جم گئے ان پر ملائکہ اترتے ہیں (اور
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ	کہتے ہیں کہ) نہ خوف کھاؤ اور نہ رنج کرو اور اس جنت
كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حم السجدہ: ۴)	کی خوش خبری سے شادکام ہو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے

دیکھیے یہاں بھی وہی بات دوسرے لفظوں میں کہی گئی ہے جو آپ کی نقل کردہ حدیث میں پائی جاتی ہے جس طرح اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ نجات اور بخشش اور دخول جنت کے لیے صرف توحید کا اعتقاد کافی ہے اور ایمان بالرسل اور عمل صالح کی ضرورت نہیں، اسی طرح مذکورۂ بالا حدیث سے بھی ایسا نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ علی ہذا القیاس جس طرح قرآن مجید کی یہ آیت اُن آیات سے معارض نہیں جو آپ نے پیش فرمائی ہیں، اُسی طرح یہ حدیث بھی اُن آیات سے معارض نہیں۔

حدیث اور قرآن دونوں کو سمجھنے میں ایک غلطی عام طور پر پیش آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور کتب حدیث دونوں کو لوگ عام تصنیفات کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح دوسری کتابوں میں ایک ایک مضمون ایک ایک جگہ بتمام و کمال بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح قرآن و حدیث میں بھی کی گئی ہوگی لیکن اصل معاملہ یہ نہیں ہے۔ قرآن ۲۳ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات اور ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا ہے۔ اسی طرح احادیث میں حضور کے وہ اقوال جمع کئے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانہ میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسب ضرورت ارشاد فرمائے ہیں۔ ان دونوں میں ایک چیز تو اسلام کی مرکزی تعلیم ہے جسے بار بار مختلف طریقوں سے دوہرا گیا ہے۔ اور دوسری چیز اسلامی ہدایت کی تفصیلات ہیں جن کو کہیں یکجا اور کہیں جدا جدا مختلف حالتوں اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سب پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے۔ ورنہ اگر کسی ایک ٹکڑے کو کہیں سے

لے لیا گیا اور دوسرے متعلق اجزا سے صرفِ نظر کر کے اسی کو ایک مستقل چیز سمجھ لیا گیا تو یقیناً غلط فہمی واقع ہو گی۔

مثال کے طور پر قرآن میں کہیں تو صرف ایمان باللہ پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ اوپر منقول ہوا۔ کہیں صرف یوم آخر کے اقرار کی تاکید ہے (الانعام:۴) کہیں خدا کے ساتھ یوم آخر کا ذکر ہے (سورہ بقرہ) کہیں خدا کے ساتھ رسولوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ (آل عمران:۱۸) کہیں خدا کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی تعلیم ہے (النور: ۹) کہیں یوم آخر اور کتب الٰہی پر اعتقاد رکھنے کی شدید تاکید ہے۔ (النساء رکوع اول) کہیں خدا اور انبیاء اور ملائکہ کے انکار کو کفر وفسق قرار دیا گیا ہے (بقرہ: ۱۲) اور کہیں ایمان کے پانچ اجزاء پورے بیان کر دئے گئے ہیں، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالیوم الآخر (بقرہ ۲۲) ان مختلف مقامات میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک مقام پر ایمانیات کو یکجا بیان کر کے دوسرے مقامات پر اُن میں سے ایک ایک دو دو کو حسب موقع وضرورت زیادہ زور دے کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس اصل سے قطع نظر کر لے اور کسی ایک آیت کو لے کر یہ دعوی کر دے کہ مومن ہونے کے لیے صرف خدا کی توحید پر، یا محض خدا اور یوم آخر پر، یا فقط خدا اور رسولوں پر ایمان لانا کافی ہے، اور یہ گمان کرے کہ اجزائے ایمان میں سے بعض کا انکار کر کے بھی بعض کا اقرار انسان کے لیے نافع ہو سکتا ہے، تو دراصل یہ قرآن کی زبان اور اس کے انداز بیان سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ ہو گا۔

اسی طرح قرآن میں کہیں صرف ایمان پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں ہے۔ اور کہیں ایمان کے ساتھ تقویٰ اور عمل صالح کو نجات کے لیے شرط ٹھیرایا گیا ہے، مثلاً وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَکُمْ اَجْرٌ عَظِیْمٌ (آل عمران:۱۸) اور وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

پھر اعمال صالحہ میں سے بھی کسی جگہ ایک کی تاکید ہے اور کسی جگہ دوسرے کی کہیں نماز اور زکوٰۃ پر زور دیا جارہا ہے، کہیں راستبازی اور حسن معاملہ پر، کہیں عفت اور حفظ فروج پر، کہیں صلۂ رحمی اور قرابتداروں کے حقوق پر، کہیں مساکین ویتامیٰ کی مواسات پر، کہیں والدین کی خدمت پر، کہیں ازدواجی قانون کے حدود پر، کہیں اکل حلال اور ترک حرام پر۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گویا فلاح ونجات کا مدار اسی پر ہے۔ اگر کوئی شخص ان احکام اور ہدایات کے پورے مجموعہ سے قطع نظر کرکے محض کسی ایک آیت کو لے اور اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن مجید محض ایمان پر نجات کی بشارت دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ عمل صالح ہو، یا اعمال صالحہ میں سے صرف نماز یا زکوٰۃ یا عفت یا صلۂ رحمی یا کسی اور چیز کو کافی سمجھتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے ساتھ دوسرے حسنات بھی ہوں، تو یہ اس کی قلت تدبر کا نتیجہ ہوگا۔ قرآن تو اپنی مجموعی تعلیم میں فکری وعملی زندگی کے لیے ایک مکمل اسکیم پیش کرتا ہے جس میں ایمانیات، اخلاقیات، اور عملی قوانین سب اپنی اپنی مناسب جگہ پر ہیں۔ مگر اس نے ان چیزوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک خاص حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک ایک ہدایت کو وہ الگ الگ مناسب مواقع پر دلوں میں اتارتا جاتا ہے۔ کبھی کوئی خاص واقعہ پیش آگیا، دیکھا کہ ذہن اس وقت ایک خاص ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار ہیں، فوراً وہ ہدایت نازل کردی گئی اور اس قوت کے ساتھ نازل کی گئی کہ قلب وروح میں پیوست ہوگئی۔ کبھی کسی خاص گروہ کی تعلیم پر حضورؐ کو مامور کیا گیا اور اس گروہ کے خاص حالات کو پیش نظر رکھ کر اسی قسم کی ہدایات دی گئیں جو ان کی اصلاح کے لیے ضروری تھیں۔ کبھی کوئی خاص تعلیم دینے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے تمثیلوں سے، اقوام گذشتہ کی نظیروں سے، انبیاء کرام کے حالات سے، آفاق وانفس کے شواہد سے دلوں کو اس کی قبولیت کے لیے تیار کیا گیا پھر وہ تعلیم دی گئی تاکہ اس کا اثر ہو، اور وہ روح میں جذب ہوجائے۔ یہ انتہا درجہ کا حکیمانہ طریق تعلیم و

تربیت اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد محض ایک اسکیم اور ایک ہدایت نامہ مرتب کر دینا نہیں تھا، بلکہ درحقیقت اپنی اسکیم کو نافذ کرنا اور ایک جماعت کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا تھا جس کے لیے تدریج اور ترتیب اور موقع و محل کی مناسبت اور نفسیاتِ انسانی کی رعایت ناگزیر تھی۔

ٹھیک ٹھیک اسی حکیمانہ طریقہ کی پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی ہے۔ ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپ ہر وقت تبلیغ و تعلیم اور اصلاح و ہدایت میں مشغول رہتے تھے۔ ہر قسم کے لوگ آپ کے پاس آتے تھے۔ ہر ایک کی ذہنیت، ہر ایک کی استعداد، ہر ایک کی اخلاقی، اعتقادی اور عملی حالت جداگانہ تھی۔ اگر آپ ہر وقت ہر شخص سے ایک ہی لگی بندھی بات کہتے اور ایک ہی قسم کی ہدایات دے کر رخصت کر دیا کرتے تو آپ کو وہ کامیابی کبھی نصیب نہ ہوتی جس نے تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ حکیم مطلق کے شاگرد تھے، اور اس حکیم نے جو طریق ہدایت اپنی کتاب میں اختیار کیا تھا اسی کی پیروی آپ بھی کرتے تھے۔ آپ کی تعلیم موقع و محل کی رعایت کے ساتھ ہوتی تھی جس وقت جس بات کا موقع ہوتا تھا، اس وقت وہی بات آپ کی زبان سے نکلتی تھی، اور سیدھی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ یہ چیزیں جو منتشر طور پر حدیثوں میں پھیلی ہوئی ہیں ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھیے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری تعلیم کیا تھی اور آپ کس طرح اس کو ذہن نشین کراتے تھے۔ اگر آپ ان اکائیوں کو جوڑ کر ایک منظم عدد نہ بنائیں گے، اور ایک ایک فرد کو الگ الگ لیکر اس سے نتائج اخذ کرنے لگیں گے تو ویسی ہی غلطی پیش آئے گی جیسی آیات قرآنی کو متفرق طور پر دیکھنے سے پیش آسکتی ہے۔

اس قاعدہ کو ملحوظ رکھکر اب ان احادیث پر نظر ڈالیے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات مختلف طریقوں سے بیان فرمائی ہیں۔

ایک مرتبہ آپ سفر میں تھے۔ ایک اعرابی نے آکر آپ کے اونٹ کی نکیل تھام لی اور عرض کیا

یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز بتائیے جو مجھ کو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ فرمایا تعبد اللہ ولا تشرك به شیئاً وتقیم الصلوٰۃ وتوتی الزکوٰۃ وتصل الرحم اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر نماز کا پابند رہ۔ زکوٰۃ دے اور قرابتداروں کے حقوق ادا کر"۔ دیکھیے۔ یہاں ایک ایسا شخص سامنے ہے جو آپ کی رسالت کا قائل ہے۔ حیات اخروی کا قائل ہے۔ اسلام قبول کر چکا ہے۔ اس کو تمام ایمانیات اور اخلاقیات کی تفصیل مطلوب نہیں۔ وہ صرف ترقی درجات کے لیے ہدایت مانگ رہا ہے۔ آپ اس کی ضرورت کے مطابق اس کو تعلیم دیتے ہیں کہ جس عقیدہ پر اسلام کی بنیاد قائم ہے اس میں مضبوط ہو جا، اور اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق ادا کیے جا۔

ایک دوسرے موقع پر کوئی اعرابی حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھ کو جنت میں پہنچا دے آپ نے فرمایا تعبد اللہ ولا تشرك به شیئا وتقیم الصلوٰۃ المکتوبۃ وتوتی الزکوٰۃ المفروضۃ وتصوم رمضان "وہ عمل یہ ہے کہ تو صرف اللہ کی بندگی کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائے، جو نماز فرض کی گئی ہے اس کا پابند رہے۔ جو زکوٰۃ مقرر کر دی گئی ہے وہ ادا کرتا رہے۔ اور رمضان کے روزے رکھے۔ اس نے کہا بخدا میں اس سے نہ زیادہ کچھ کروں گا نہ کم۔ جب وہ واپس چلا گیا تو حضور نے فرمایا جو شخص اہل جنت میں سے کسی کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرنی چاہتا ہو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ اب حضور کی تعلیم اور اس شخص کے جواب اور پھر آپ کے آخری ارشاد پر غور کیجیے۔ ایک سچا مسلمان سامنے تھا۔ نبی کی ہر ہدایت کو صدق دل سے قبول کرنے کو تیار تھا۔ اس کو صرف یہ سمجھانے کی ضرورت تھی کہ خدا کی جنت میں داخل ہونے کے لیے بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کی حاجت نہیں، چلّے کھینچنے اور رات رات بھر وظیفے

پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی دنیا داری کی زندگی میں اگر تو اپنے اعتقاد کو شرک سے پاک رکھے اور خدا کے عائد کیے ہوئے فرائض ادا کرتا رہے تو جنت تجھے مل سکتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسری قسم کی حدیث ملاحظہ کیجیے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے ایک مشن پر بھیجا تو فرمایا کہ تم اہل کتاب کی ایک قوم میں پہنچو گے سب سے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دینا کہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دیں اور یہ تسلیم کریں کہ میں اللہ کا رسول ہوں جب وہ اس کو مان لیں تو ان سے کہنا کہ اللہ نے تم رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں جب وہ اس کو بھی مان لیں تو کہنا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو تمہارے مالداروں سے لی جائے گی اور تمہارے غریبوں کو دیدی جائے گی جب وہ اس کو بھی مان لیں تو خبردار ان کے مال کو ہاتھ نہ لگانا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ اسی نوعیت کی دوسری احادیث میں ہے امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوہ عصموا منی دماءھم واموالھم وحسابھم علی اللہ۔ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کا رسول ہے، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ پھر جب انھوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ہاتھ ہے) اور امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ ویومنوا بی و بما جئت بہ فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اور مجھ پر اور ان سب باتوں پر ایمان لائیں جو میں لایا ہوں پھر جب انھوں نے ایسا کر دیا تو مجھ سے اپنی جانوں

اور مالوں کو بچا لیا۔ الّا یہ کہ ان کے خلاف کوئی حق قائم ہو جائے۔ اس کے بعد ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے)۔ ان احادیث میں حضورؐ نے اسلام کا دستوری قانون بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص خدا کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کو ماننے کا اقرار کرے تو وہ دائرہ اسلام میں آجاتا ہے۔ یہ بات کہ وہ حقیقی مومن ہے یا نہیں اس کا فیصلہ اللہ کرنے والا ہے ہم اس کا فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں کہ لم اومر ان اشق عن قلوب الناس ولا عن بطونھم۔[1] عصمت جان و مال مجرد کلمہ توحید اور اعتقاد رسالت کے اقرار سے ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کسی کو دست درازی کا حق نہیں رہتا البتہ اگر کوئی شخص خدا کا حق یا بندوں کا حق ادا کرنے سے انکار کرے تو اس کو جرم کے مطابق سزا دی جا سکتی ہے۔

دیکھیے یہاں کوئی خاص شخص پیش نظر نہ تھا بلکہ عام ہدایات دی جا رہی تھیں، اس لیے صرف قانون کے حدود بیان کرنے پر اکتفا کی گئی۔ یہ نہیں فرمایا کہ اقرار توحید و رسالت اور ادائے فرائض سے ہر شخص کے لیے جنت واجب ہو جائے گی۔ نیز اس موقع پر آپ نے ہر شخص کو تمام ایمانیات اور عملی قوانین سے آگاہ کرنے کا حکم بھی نہیں دیا، کیونکہ یہاں صرف یہ سمجھانا مقصود تھا کہ اسلام اور غیر اسلام کی سرحد کیا ہے۔ اور اسلام کی سرحد میں داخل ہوتے ہی انسان کو کیا حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک اس آیت کے مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ۔ (اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں چھوڑ دو)۔ پس کسی شخص کو ان قانونی ہدایات سے یہ نتیجہ نکالنے کا حق نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید و رسالت کے اقرار اور ادائے نماز و زکوٰۃ میں اسلام کو محدود رکھتے تھے اور ان کے سوا کسی اور چیز کی کوئی اہمیت آپ کی نگاہ میں نہ تھی۔

---

[1] مجھ کو لوگوں کے دل چیرنے اور ان کے باطن ٹٹولنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

اوپر آپ نے دو قسم کی حدیثیں دیکھیں۔ ایک وہ جن کے مخاطب خاص لوگ تھے۔ ان میں آں حضرت صلعم نے ان لوگوں کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر تعلیم دی ہے۔ دوسری وہ جن کا موضوع استفہام عمومی تھا۔ ان میں حضور نے عام قانونی ہدایات دی ہیں اور اسلام و کفر کا امتیاز بیان فرمایا ہے۔
اب ان احادیث کو دیکھیے جن کے مخاطب خواص صحابہ تھے۔

ایک مرتبہ حضور سواری پر چلے جا رہے تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کے ردیف تھے آپ نے تین مرتبہ ٹھیر ٹھیر کر آواز دی یا معاذ بن جبل۔ اور حضرت معاذ نے ہر مرتبہ عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک۔ اس طرح تین مرتبہ پکار کر جب آپ نے مخاطب کو اچھی طرح اپنی جانب متوجہ کر لیا اور آپ کو یقین ہو گیا کہ جو بات آپ فرمانا چاہتے ہیں اس کو سننے والا خاص اہمیت کے ساتھ سنے گا تب فرمایا جانتے ہو بندوں پر خدا کا کیا حق ہے؟" انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا" اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرائیں"۔ تھوڑی دور آگے چل کر پھر آواز دی یا معاذ بن جبل۔ انہوں نے عرض کیا لبیک یا رسول اللہ وسعدیک۔ فرمایا" پھر جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے جبکہ وہ ایسا کریں؟" انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا" ان کا حق یہ ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے"۔
حضرت معاذ نے یہ سن کر پوچھا" کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت دے دوں"؟۔ فرمایا" نہیں! ان کو بشارت نہ دو کیوں کہ وہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے"۔

ایک اور موقع پر حضور اپنے خاص صحابیوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ یکایک آپ اٹھے اور تشریف لے گئے۔ جب بہت دیر گذر گئی تو صحابہ کو تشویش ہوئی کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ ڈھونڈنے نکلے۔ سب سے پہلے جو صاحب گئے وہ حضرت ابوہریرہ تھے۔ یہ سرکار کو تلاش کرتے ہوئے انصار کے ایک باغ پر پہنچے جس کا دروازہ تلاش کے باوجود نہ ملا۔ آخر ایک چھوٹی سی نہر کے رستے اندر پہنچے۔ دیکھا تو

حضور تشریف فرما ہیں۔ آپ نے پوچھا کیسے آئے۔ انہوں نے ماجرا عرض کیا۔ آپ نے اپنی دونوں جوتیاں اٹھا کر انہیں دے دیں اور فرمایا انہیں لے جاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص ایسا ملے جو لا الہ الا اللہ کی شہادت دیتا ہو اور اس پر دل سے یقین رکھتا ہو اسے جنت کی بشارت دے دو۔ یہ اس حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں سب سے پہلے حضرت عمر ملے۔ انہوں نے پوچھا یہ جوتیاں کیسی ہیں انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین ہیں اور آپ نے مجھے ایسا اور ایسا کہنے کا حکم دیا ہے حضرت عمر نے یہ سن کر ان کے ایک زور کا دھپ رسید کیا اور کہا کہ واپس جاؤ۔ یہ گرتے پڑتے بھاگے اور جا کر حضور سے سارا معاملہ بیان کیا۔ اتنے میں حضرت عمر بھی پہنچ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ عمر! کس چیز نے تم کو اس حرکت پر آمادہ کیا؟ انہوں نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا آپ نے ابو ہریرہ کو ایسا اور ایسا کہنے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور نے فرمایا ہاں۔ حضرت عمر نے عرض کیا ایسا نہ کیجیے۔ مجھے خوف ہے کہ لوگ اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ انہیں عمل کے لیے چھوڑ دیجیے۔ آپ نے فرمایا اچھا تو انہیں عمل کے لیے چھوڑ دو۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ ایک سپید کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں۔ یہ واپس ہو گئے۔ دوبارہ حاضر ہوئے تو آپ اٹھ چکے تھے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا ما من عبد قال لا الہ الا اللہ ثم مات علیٰ ذالک الا دخل الجنۃ۔ جس بندے نے کہدیا کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اسی پر جان دی وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا انہوں نے پوچھا وان زنیٰ وان سرق (اگرچہ اس نے زنا کی ہو؟ اگرچہ اس نے چوری کی ہو؟) آپ نے فرمایا وان زنیٰ وان سرق۔ انہوں نے پھر بھی پوچھا اور آپ نے پھر بھی جواب دیا۔ انہوں نے سہ بارہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا ہاں وان زنیٰ وان سرق علیٰ رغم انف ابی ذر۔

ان تینوں حدیثوں پر غور کیجیے۔ مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے کامل الاسلام ہونے میں کوئی شبہہ نہیں وہ تعلیمات قرآنی اور قوانین اسلامی سے نہ صرف خوب واقف ہیں بلکہ ان پر پوری طرح عامل بھی ہیں

ان کے سامنے حضور نے جو کچھ فرمایا اس سے یہ اندیشہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ وہ دوسرے ایمانیات اور اعمال صالحہ کو غیر ضروری سمجھ لیں گے۔ اس لیے ان کو آپ نے یہ حقیقت بتا دی کہ اسلام میں سب سے اہم چیز عقیدۂ توحید ہے، اور یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا یہ اعتقاد درست ہو اور پوری طرح راسخ ہو جائے وہ اللہ کے عذاب میں گرفتار نہیں ہو سکتا۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بالکل خدا کی رضا کا تابع کر دے اور راہ راست پر قائم ہو جائے۔ سچے موحد کے لیے آیات الٰہی سے انکار اور مرضات الٰہی سے انحراف دونوں ناممکن ہیں، لہٰذا اس کا موحد ہونا ہی اس کے صحیح الایمان اور طاہر الاخلاق اور صالح الاعمال ہونے کو مستلزم ہے۔ تاہم اگر وہ غلطی سے مرتکب گناہ ہو بھی جائے تو یقیناً وہ اپنے گناہ پر متنبہ ہوتے ہی توبہ کرے گا۔ اور اگر توبہ کی توفیق نہ بھی ملی تو بقدر گناہ سزا پا کر آخر کار ضرور جنت میں داخل ہو گا۔ خلود فی النار کی سزا اس کو ہرگز نہیں مل سکتی۔

مذکورۂ بالا احادیث اور ان کی ہم معنی دوسری احادیث کا یہی مفہوم صحابۂ کرام نے سمجھا تھا اور یہی ان کا حقیقی مفہوم تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ خیال نہ کیا کہ بس عقیدۂ توحید ہی کافی ہے، اس کے بعد نہ رسالت کو ماننے کی ضرورت ہے، نہ کلام اللہ کو، اور نہ پاکیزگیٔ اخلاق مطلوب ہے، نہ خیریتِ اعمال۔ ایسا غلط مفہوم وہ کس طرح سمجھ سکتے تھے، جبکہ ان کو پوری طرح بتا دیا گیا تھا کہ اسلام کیا ہے اور اس میں کن چیزوں کا اعتقاد، کن عبادات کی پابندی، کن حدود کی حفاظت، کن قوانین کی اطاعت اور کن طریقوں سے اجتناب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے یہ تعلیم صرف کاملین کو دی اور عوام کے سامنے اس کو بیان کرنے سے منع فرما دیا۔ معاذ بن جبل والی حدیث میں آپ نے اس کی وجہ بھی خود ہی بیان فرما دی ہے کہ عام لوگ اس کو سن کر غلط فہمی میں پڑ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ والی حدیث میں ایک شخص کو یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے شائد عوام سے اس کو بیان کرنے کی اجازت دی تھی۔ خود حضرت عمر کو بھی ایسا ہی شبہہ ہوا تھا۔ لیکن دراصل حضور کا مقصد کامل الاسلام

لوگوں کو بشارت دینا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے اپنا اندیشہ بیان کیا تو آپ نے ان کی رائے سے اتفاق فرمایا۔ اسی طرح حضرت ابو ذرؓ والی حدیث میں بھی کوئی شخص یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ قال لا الٰہ الا اللہ سے مجرد زبانی قول مراد ہے۔ اس لیے کہ حضورؐ نے دوسرے مواقع پر تصریح فرمائی ہے کہ دخول جنت کے لیے توحید پر کامل ایمان کی ضرورت ہے۔ کہیں مستیقنًا بہا قلبہ فرمایا۔ کہیں عبد غیر شاکٍ فرمایا۔ اور کہیں دوسرے الفاظ ارشاد فرمائے جو اسی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔

بہرحال یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن احادیث میں توحید کی اہمیت بیان کی گئی ہے ان کا خطاب دراصل ان لوگوں سے ہے جو تمام شرائط کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہوں۔ نہ کہ اُن لوگوں سے جو مسلمان ہی نہ ہوں۔ پھر مسلمانوں کو بھی اعتقاد توحید پر دخول جنت کی بشارت دینے سے یہ مراد نہیں کہ بس خدا کی وحدانیت مان لو۔ پھر جس قسم کی بدعقیدگی، اور فسق و فجور، اور بدعت و معصیت میں چاہو مبتلا ہو جاؤ۔ بلکہ اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمان کی کامیابی کا مدار سب سے بڑھ کر اعتقادِ توحید کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔ اس میں اگر خرابی آ گئی تو پھر کوئی چیز نافع نہیں ہو سکتی اور اگر یہ صحیح و مضبوط ہو تو آخری کامیابی حاصل ہو کر رہے گی۔ اسی جہت سے اس معنی کی احادیث اُس آیت قرآنی سے مطابق ہوتی ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔

مطبوعات

الجمعۃ والہند | تالیف مولوی شیخ محمد رفعۃ اللہ صاحب صدیقی ۔ ضخامت ۴۴ صفحات ۔ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر ذیل کے پتہ سے طلب کیا جا سکتا ہے:۔ مولوی عثمان احمد صاحب بمقام لبو ۔ پوسٹ مینا ۔ ریاست پالن پور

اس رسالہ میں مؤلف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ فقہ حنفی میں اقامت جمعہ کے لیے مصر کی جو شرط رکھی گئی ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور آیا ہندوستان کے دیہات وقصبات میں نماز جمعہ کو موقوف کرنا درست ہے یا نہیں۔ مسئلہ علماء احناف میں مختلف فیہ ہے۔ ایک جماعت "مصر" کی انہی تعریفات پر زور دے رہی ہے جو قدیم کتب فقہیہ میں پائی جاتی ہیں مگر مؤلف نے احادیث اور اقوال فقہاء سے ثابت کیا ہے کہ اس باب میں بہترین فتویٰ وہ ہے جو حضرت ملا نظام الدین رحمۃ اللہ اور مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ نے دیا ہے، یعنی یہ کہ اقامت جمعہ کی غرض کے لیے ہر اس بستی پر شہر کا اطلاق ہوگا جو بالکل کوردہ نہ ہو، اور جہاں آبادی کی عام ضروریات پوری کرنے کے لیے اہل حرفہ اور دوکاندار موجود ہوں۔ اسی سلسلہ میں جمعہ کے متعلق دوسرے مسائل بھی آگئے ہیں، مثلاً احتیاط الظہر اور ایک ہی شہر میں متعدد مقامات پر جمعہ کی اقامت، اور خطبہ کی زبان وغیرہ۔

نظام عمل | تالیف مولانا عبد الحامد قادری بدایونی ضخامت ۲۲۵ صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ محمد عابد القادری۔ دار التصنیف، مولوی محلہ بدایوں۔

اس کتاب میں مؤلف نے آیات واحادیث سے مسلمان کی زندگی کا پورا نظام عمل پیش کیا ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، قوانین معاشرت، اصول سیاست، نظم معیشت غرض اسلامی

زندگی کے اکثر و بیشتر پہلو اس میں بیان کر دیئے گئے ہیں، اور جگہ جگہ مسائل اسلامی کو سمجھانے کے لیئے دلچسپ اور دل نشین تشریحات بھی کی گئی ہیں۔ زبان نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ مسائل کے بیان میں فقیہانہ اور متکلمانہ بحثوں سے اجتناب کر کے صرف وہی معلومات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی عام مسلمانوں کو ضرورت ہے۔ ترتیب کتاب میں اصلاح و ترقی کی بہت گنجائش تھی۔ مگر مولف کی یہی خدمت کیا کچھ کم قابل داد ہے کہ انہوں نے کثرت مشاغل کے باوجود ایک ایسی کتاب مرتب کر دی جو موجودہ حالات میں عامہ مسلمین کی مذہبی رہنمائی کے لیے بہت مفید ہے۔

عباد اللہ — تالیف مولوی میر محمد صاحب ربانی، مدرس فارسی ہائی اسکول۔ رحیم یار خاں۔ ریاست بہاولپور ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

مؤلف نے تعلیمات قرآنی کی اشاعت کے لیے تفسیر قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے اور سہولت کے لیے اس کو چھوٹے چھوٹے رسالوں کی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر ہے اس میں سورہ فرقان کے چھٹے رکوع کی تفسیر بیان کی گئی ہے جو وعباد الرحمن یمشون علی الارض ھونًا سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں مومن کی صفات مفصل بیان فرمائی ہیں۔ مؤلف نے ابتدا میں اس کا لفظی ترجمہ دیا ہے اور پھر ایک ایک صفت کی تشریح کی ہے۔ بیان عام فہم اور موثر ہے۔ اس قسم کے رسالوں کی اشاعت مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے بہر طور مفید ہے۔

معلم الصلاۃ — تالیف حکیم سید محمد حسن صاحب بخاری۔ کپورتھلہ۔ ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ۵

اس رسالہ میں مؤلف نے ان تمام عبارتوں اور قرآنی سورتوں اور دعاؤں کا سلیس ترجمہ اردو اور پنجابی زبان میں لکھا ہے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ابتدا میں قرأت کے ابتدائی اصول سمجھائے ہیں۔ پھر تمام عربی عبارات کے الگ الگ الفاظ لکھکر ان کے نیچے لفظی ترجمہ اور لفظی

ترجمہ کے نیچے بامحاورہ ترجمہ درج کیا ہے۔ غیر عربی دان لوگوں کو سمجھ کر نماز ادا کرنے میں یہ کتاب بہت مدد دے سکتی ہے۔

تحفۂ اسلام | انجمن رفیق الاسلام گوڈگانوہ ایک مدت سے خاموشی کے ساتھ تبلیغ دین کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ اس نے ابتک متعدد رسالے مفت شائع کیے ہیں جو سب کے سب عوام کی ذہنی رہنمائی کے لیے مفید ہیں۔ زیر نظر رسالہ اس سلسلہ کا چودھواں رسالہ ہے جس میں اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ بہت ہی سلیس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف ضروری معلومات درج کی گئی ہیں، بلکہ دماغوں کو اپیل کرنے والے دلائل کے ساتھ اسلام کی ہر ہر تعلیم کو سمجھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ رسالہ جیبی تقطیع کے ۴۴ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیجکر طلب کیا جاسکتا ہے۔

دعائیں | تالیف مولوی ابوالحسن علی صاحب معلم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۲ ر

اس رسالہ میں مؤلف نے قرآن مجید اور احادیث نبوی سے دعائیں جمع کی ہیں اور ہر دعا کے مقابل اس کا ترجمہ دے دیا ہے۔ دعا درحقیقت عبادت کا مغز اور اس کی جان ہے خدا پرستی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ بندہ اپنی ہر حاجت میں خدا کی طرف رجوع کرے، اور زندگی کے ہر معاملہ میں اس سے مدد مانگے۔ علاوہ بریں دعا اس نصب العین اور مطمح نظر پر بھی روشنی ڈالتی ہے، جو دعا مانگنے والے کے پیش نظر ہو۔ انسان جس قدر بلند خیال اور پاکیزہ خو ہوگا ویسی ہی بلند اور پاک اس کی حاجتیں بھی ہوں گی، اور انہی حاجتوں کا اظہار وہ اپنی دعائیں کرے گا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جو دعائیں ہم کو سکھائی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے مختلف احوال میں اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے جو دعائیں اپنے خدا سے مانگی ہیں وہ ایک طرف ہم کو یہ بتاتی ہیں کہ مسلمان کس طرح ہر ہر معاملہ میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے، اور دوسری طرف

تعلیم ہم کو دیتی ہیں کہ ایک سچے مسلمان کے مقاصد حیات کیا ہیں اور اس کی نگاہ میں کیا چیزیں اہمیت رکھتی ہیں جن کو وہ اپنے مولیٰ کی مدد سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اسباق النحو حصہ دوم | تالیف مولانا حمید الدین فراہی مرحوم ضخامت ۵۶ صفحات قیمت ۶ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔

اس سلسلے کے حصہ اول پر ہم پہلے تبصرہ کر چکے ہیں جس میں اسم کی بحث تھی۔ اب یہ دوسرا حصہ بھی شائع ہو گیا ہے جو فعل کے بیان میں ہے۔ حصہ اول پر جو رائے ظاہر کی جا چکی ہے اس پر اب کسی اضافہ کی حاجت نہیں۔

تفسیر آیۃ الیوم اکملت لکم دینکم (۲) وصیت رسول (۳) مسلمانوں پر ایک نظر | یہ تینوں رسائل مولوی سید ابوالحسن علی صاحب معلم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تالیف سے ہیں۔

پہلے رسالہ میں مولف نے تکمیل دین کے معنی سمجھائے ہیں۔ تکمیل دین کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو جو کچھ ہدایت دینی تھی اور بندوں کو دین و دنیا کی بہتری کے لیے جس ہدایت کی ضرورت تھی وہ پوری کی پوری دے دی گئی۔ اب اس میں نہ کچھ گھٹانے کی ضرورت ہے نہ بڑھانے کی۔ مسلمان اگر فلاح پا سکتے ہیں تو دین کی پوری تعلیم پر اعتقاد رکھ کر اور عمل کر کے ہی پا سکتے ہیں۔ کمی کریں گے تب بھی نقصان اٹھائیں گے اور زیادتی کریں گے تب بھی نقصان اٹھائیں گے۔ دوسرے رسالہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیتیں جمع کی گئی ہیں اور مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم کو سرکار سے محبت ہے تو ان وصیتوں کو پورا کرو۔

تیسرے رسالہ میں مولف نے بتایا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو دیکھ کر قلب پر تین اثر پڑتے ہیں۔ پہلی نظر میں حیرت ہوتی ہے کہ یا تو یہ امت کبھی ہزاروں کی تعداد میں تھی، یا اب کروڑوں تک پہنچ چکی ہے اور روئے زمین کے گوشہ گوشہ میں پہنچی ہوئی ہے۔ دوسری نظر میں تحیر طاری ہو جاتی ہے کہ یا تو اس قلیل اور بے سرو سامان گروہ کی سطوت کا وہ عالم تھا، یا اب اس عظیم الشان قوم کی کمزوری اس حد کو پہنچ گئی ہے۔ تیسری نظر میں دل پر حسرت چھا جاتی ہے کہ کاش ان بیکار کروڑوں کے بجائے ہی کارآمد ہزاروں ہم میں ہوتے۔ تین پیسے کے ٹکٹ بھیج کر تینوں رسالے مفت طلب کیے جا سکتے ہیں۔ ملنے کا پتہ دفتر ندوۃ العلماء لکھنؤ۔